ذوالقعدہ ۱۴۴۵ھ
مئی ۲۰۲۴ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات

تنظیمِ اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- ڈاکٹر اسرار احمدؒ... فِی ذِمَّۃِ اللّٰہ
- اسرائیلی ریاست اور سورۃ الاسراء کی ابتدائی آیات
- نالۂ فلسطین
- معرکۂ رُوح وبدن

داعیٔ رجوع الی القرآن،بانیٔ تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

کی شہرۂ آفاق پزیرائی اور مقبولیت کے بعد اب پیش ہے:

امپورٹڈ میٹ پیپر ❁ مضبوط مراکو جلد ❁ 1248 صفحات

~~4500/-~~ روپے کے بجائے

صرف -/2200 روپے میں

فری ہوم ڈیلیوری کے ساتھ

رمضان المبارک کا خصوصی تحفہ

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

K-36،ماڈل ٹاؤن لاہور،فون 3-35869501(042)

maktaba@tanzeem.org 0301-1115348

وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَمِيۡثَاقَهُ الَّذِىۡ وَاثَقَكُمۡ بِهٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

جلد : 73

شمارہ : 5

ذوالقعدہ 1445ھ

مئی 2024ء

فی شمارہ : 50روپے

سالانہ زرِتعاون : 500روپے

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مُدیر

حافظ عاکف سعید

مجلس ادارت:

ایوب بیگ مرزا، خورشید انجم

نائب مُدیر

حافظ خالد محمود خضر

ادارتی معاون:

حافظ محمد زاہد، محمد خلیق

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700، فون: 3-35869501

ای میل: maktaba@tanzeem.org، 0301-111-5348

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: "دارُالاسلام" ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-35473375(042)

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال — 5

امارتِ اسلامیہ افغانستان اور غزہ

خورشید انجم

بیان القُرآن — 9

سُورۃُ الۡبُرُوۡج + سُوۡرَۃُ الطَّارِقِ

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

یادِ رفتگاں — 18

ڈاکٹر اسرار احمدؒ: فِیۡ ذِمَّۃِ اللّٰہِ

محمد زکریا خان

تذکّر و تدبّر — 23

اسرائیلی ریاست اور

سورۃ الاسراء کی ابتدائی آیات

زین العابدین

ارضِ فلسطین — 37

غزہ میں معرکۂ روح و بدن

ریان بن نعمان

فکر و نظر — 45

نالۂ فلسطین

ڈاکٹر ربیعہ ابرار

تحریک جماعت اسلامی — 58

اسلامی نظام بذریعہ انتخابات

مولانا مودودیؒ کے موقف میں تبدیلی (۲)

سعادت محمود

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

امارتِ اسلامیہ افغانستان اور غزہ

افغان طالبان کی حکومت‘ یعنی امارتِ اسلامیہ افغانستان‘ کو قائم ہوئے تقریباً پونے تین سال ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک دنیا میں کسی نے اسے باقاعدہ طور پر تسلیم نہیں کیا۔ المیہ یہ ہے کہ کسی مسلمان حکومت نے بھی ایسا نہیں کیا۔ جہاں تک غیر مسلم دنیا کا تعلق ہے تو صاف ظاہر ہے کہ وہ چاہتی ہے کہ افغان طالبان اپنے نظریے پر چلنے کی بجائے عالمی استعماری نظام کو قبول کر لیں۔ خاص طور پر جس طرح کا معاشی نظام اس وقت دنیا کو اپنے معاشی پنجے میں جکڑے ہوئے ہے‘ افغان طالبان بھی اسی کی پیروی کریں تاکہ وہ بھی عالمی طاقتوں کی معاشی جکڑ بندی میں آ جائیں اور یوں طاغوتی طاقتوں کے مطالبات کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے چلے جائیں۔

افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ہمارے مسلمان بھائی بھی افغان طالبان کو اسلامی نظریہ پر قائم دیکھنے کی بجائے انہیں عالمی طاغوتی نظام کو تسلیم کر لینے پر مجبور کر رہے ہیں۔ ان کا نکتہ اعتراض وہی پرانا ہے جو نائن الیون کے بعد بھی تھا کہ آج کے دور میں مروجہ عالمی نظام کی پیروی کیے بغیر کوئی بھی ریاست نہیں چل سکتی‘ آپ کو اپنی بقا کے لیے دنیا کے قوانین وضوابط پر عمل پیرا ہونا پڑتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل پاکستان کے ایک نامور کالم نویس نے تو طاغوت کی ترجمانی کرتے ہوئے اس کی خدائی کو تسلیم کرنے کی بالواسطہ دعوت بھی دے ڈالی ہے۔ موصوف کا کہنا تھا کہ ’’افغانستان قحط کے دہانے پر کھڑا ہے۔ اقتصادیات کا کوئی وجود نہیں۔ دنیا اگر نہ چاہے تو خوراک مل سکتی ہے نہ شناخت۔ جب تک طالبان کی حکومت کو قبول نہیں کیا جاتا‘ افغانستان دنیا سے الگ تھلگ رہے گا۔ یہ قبولیت امریکہ کی مرضی کے بغیر نہیں مل سکتی۔‘‘ موصوف کی جو بات انتہائی تکلیف دہ اور قابلِ مذمّت ہے وہ یہ کہ ’’آزادی افغانستان سے آج بھی اتنے ہی فاصلے پر ہے جتنی طالبان سے پہلے تھی۔‘‘

نائن الیون کے بعد بھی عالمی میڈیا اور سیکولر دانشوروں کے یہی دعوے تھے کہ افغان طالبان بس چند دنوں کی مار ہیں‘ ان کا وجود صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے گا‘ امریکہ کے سامنے کوئی نہیں ٹھہر سکتا‘

وغیرہ۔لیکن پھر دنیا نے دیکھا کہ وہی امریکہ جس کی خدائی کے دعوے اس کے ترجمان کر رہے تھے‘ بیس سال افغانستان میں مار کھاتے کھاتے آخر ۱۵ اگست ۲۰۲۱ء کو ذلیل ہو کر افغانستان سے نکل بھاگا۔ اس غیر معمولی واقعہ میں سب کے لیے نشانیاں ہیں کہ اس دنیا کا نظام امریکہ نہیں بلکہ اس کائنات کا خالق و مالک چلا رہا ہے‘ جس کی مرضی کے بغیر پتّا بھی نہیں ہل سکتا۔ مسلمانوں کو یہ جان لینے کی ضرورت ہے کہ امریکہ ان پر جو طاغوتی غلبہ حاصل کر رہا ہے یہ دراصل اُمّتِ مُسلمہ کے گناہوں اور خطاؤں کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کے فیصلے کسی نہ کسی صورت میں صادر ہوتے ہیں‘ غالب اُسی ذاتِ برحق کا حکم ہوتا ہے۔ جہاں تک مؤمنین صادقین کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب میں یہ فیصلہ سنا دیا ہے کہ: ’’تم ہی غالب ہو گے اگر تم ایمان والے ہوئے!‘‘

المیہ افغانستان میں نہیں‘ اسلام سے مسلمانوں کے دور ہونے میں ہے۔اس کی وجہ سے وہ معاملات کو قرآن وسُنّت کی نظر سے دیکھنے کی بجائے مغرب کے اندازِ فکر کو ترجیح دیتے ہیں۔ دنیا کی کامیابی کو اصل کامیابی اور اس کے نقصان کو المیہ سمجھتے ہیں۔ جبکہ اصل المیہ تو آخرت کی ناکامی ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ دنیا اصل زندگی نہیں بلکہ ایک امتحان گاہ ہے۔ یہ آزمائش افغان طالبان کے لیے بھی تھی‘ بلکہ ہے اور امریکہ کی زبان بولنے والوں کے لیے بھی۔ اللہ ربّ العزت قرآن حکیم میں مسلمانوں سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے:

﴿اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ وَلَمَّا یَاۡتِکُمۡ مَّثَلُ الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِکُمۡ ؕ مَسَّتۡہُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَزُلۡزِلُوۡا حَتّٰی یَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَہٗ مَتٰی نَصۡرُ اللّٰہِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰہِ قَرِیۡبٌ ﴿۲۱۴﴾﴾ (البقرۃ)

’’پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا‘ حالانکہ ابھی تم پر وہ سب حالات نہیں گزرے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکے ہیں۔ اُن پر سختیاں گزریں‘ مصیبتیں آئیں‘ ہلا مارے گئے‘ حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اُس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ (اُس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ) ہاں اللہ کی مدد قریب ہے!‘‘

آج جیسے دانشور اگر اسلام کے ابتدائی دور میں مکہ میں موجود ہوتے اور حضرات سُمیّہ و یاسر‘ بلالِ حبشی اور خباب بن الارت (رضی اللہ عنہم) پر گزرنے والی مصیبتوں کا حال اور شعب ابی طالب میں مسلمانوں کی حالت زار اور فاقوں کی کیفیت دیکھتے تو اسی طرح واویلا کرتے نظر آتے کہ کفر کے

نظام کے ساتھ سمجھوتا کیے بغیر اس دنیا میں بقا ممکن نہیں۔ مشرکینِ مکّہ کا مطالبہ بھی تو یہی تھا کہ ہمارے ساتھ مفاہمت کرلو۔ یعنی کچھ قوانین اپنے چلاؤ اور کچھ ہمارے نظام کو اپنا لو تو ہم سب مل کر رہ سکتے ہیں۔ آج جو دانشور امارتِ اسلامیہ افغانستان میں انسانی المیہ کا راگ الاپ رہے ہیں اور بین کر رہے ہیں، ان کا اصل مدّعا بھی یہی ہے کہ افغان طالبان عالمی قوانین کو اپنا لیں تو پھر کوئی مسئلہ باقی نہیں رہے گا۔ ان کو عالمی امداد بھی آئے گی، ڈالروں کی بارش بھی ہوگی اور تجارتی وفود بھی آنا شروع ہو جائیں گے۔ دنیا بھی راضی ہوگی اور افغانی بھی خوشحال ہو جائیں گے۔ یہ موجودہ عالمی نظام کے مستری اور دانشور کہہ رہے ہیں، جبکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتا ہے:

﴿وَلَنۡ تَرۡضٰی عَنۡکَ الۡیَہُوۡدُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَہُمۡ ؕ قُلۡ اِنَّ ہُدَی اللّٰہِ ہُوَ الۡہُدٰی ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَہۡوَآءَہُمۡ بَعۡدَ الَّذِیۡ جَآءَکَ مِنَ الۡعِلۡمِ ۙ مَا لَکَ مِنَ اللّٰہِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیۡرٍ ﴿۱۲۰﴾﴾ (البقرۃ)

’’یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے دین (نظام) پر نہ چلنے لگو۔ صاف کہہ دو کہ راستہ بس وہی ہے جو اللہ نے بتایا ہے۔ ورنہ اگر اُس علم کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے، تم نے اُن کی خواہشات کی پیروی کی تو تمہارے لیے اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار نہیں ہے۔‘‘

دنیا کی آنکھ سے دیکھنے والوں کو کامیابی اس میں نظر آرہی ہے کہ افغان طالبان عالمی نظام کے مطیع ہو جائیں، جبکہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ پھر سب اچھا نہیں ہوگا بلکہ یہ بہت ضرر رساں اور الم ناک ہے۔ یہی تو اس دنیا کی زندگی کی اصل حقیقت ہے جس کو وہ اذہان سمجھ نہیں پاتے جن کی فکری بلوغت مغربی نظام اور فکر کے تحت ہوئی ہے۔ اس آزمائش میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنیادی تقاضا ہی یہی ہے کہ مسلمان کس کو رب مانتے ہیں، کس پر بھروسا کرتے ہیں!

﴿وَلَنَبۡلُوَنَّکُمۡ بِشَیۡءٍ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ وَنَقۡصٍ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَصَابَتۡہُمۡ مُّصِیۡبَۃٌ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّاۤ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ ﴿۱۵۶﴾﴾ (البقرۃ)

’’اور ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے کسی قدر خوف کے ذریعے، بھوک کے ذریعے، مال اور جان کے نقصان سے اور پھلوں کی کمی سے۔ اور (اے نبی ﷺ!) صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دیجیے۔ وہ لوگ کہ جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ہم تو

اللہ کے ہیں اور ہم اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔‘‘

افغان طالبان نے بیس سال عسکری میدان میں اپنا خون پیش کیا۔ طاغوتی قوتوں نے لاکھوں مسلمان تہِ تیغ کر ڈالے۔ کڑکتی دھوپ میں کنٹینروں میں بند کر کے شہید کیے گئے‘ ان کے گھر بار اُجڑ گئے‘ کھیت کھلیان چھین لیے گئے۔ عالمی میڈیا اور سیکولر دانشوروں کو انسانی المیہ اس وقت نظر کیوں نہ آیا جب افغانستان پر بلاوجہ جنگیں مسلّط کر کے افغانیوں کا جانی اور مالی نقصان کیا گیا؟ ان کو صرف اسلامی نظام کے نفاذ میں ہی انسانی المیہ کیوں نظر آتا ہے؟ طاغوتی نظام کے تحت قتل و غارت گری بھی انہیں قبول ہے‘ لیکن اسلامی نظام کا امن انہیں قبول نہیں!

افغان طالبان نے جہاد کے دوران طاغوتی طاقتوں کے تمام تر ظلم و جبر اور قتل و غارت گری کے ماحول میں بھی ایمان پر ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا‘ تب اللہ عزّوجل نے ان کو فتح عطا فرمائی ہے۔ اسی طرح معاشی جنگ میں بھی اللہ تعالیٰ ان کو سرخرو کرے گا‘ ان شاء اللہ!

حقیقت یہ ہے کہ آج غزہ میں بعینہٖ وہی حالات ہیں جو نائن الیون کے بعد افغانستان میں تھے۔ جس طرح افغانستان پر پوری دنیا متحد ہو کر ٹوٹ پڑی تھی آج غزہ میں بھی اسرائیلی درندگی کو مغربی حکومتوں کی بلا واسطہ اور اکثر مسلمان ممالک کی بالواسطہ معاونت حاصل ہے۔ امریکہ اور مغربی یورپ کے ممالک تو کھل کر اسرائیل کا ساتھ دے رہے ہیں۔ دوسری طرف مسلمان ممالک کی خاموشی بلکہ بعض معاملات میں اقوال و افعال کے ذریعے ظالم کی تائید و رفاقت صہیونیت کے لیے تقویت کا باعث بن رہی ہے اور یہ اُسی کا پلڑا بھاری کر رہے ہیں۔ گویا جس طرح افغانستان کے خلاف سب نے مل کر طاغوت کا ساتھ دیا تھا‘ آج اہلِ غزہ کے معاملے میں بھی اس بدترین تاریخ کو دہرایا جا رہا ہے۔ اہلِ غزہ اپنی جانوں کی قربانی دے کر درحقیقت اُمّتِ مُسلمہ اور مسجدِ اقصیٰ کے تحفظ کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ۳۵۰۰۰ سے زائد شہداء جن میں اکثریت عورتوں اور معصوم بچوں کی ہے۔ جرأت‘ بہادری اور عزمِ مصمّم کی زندہ تصویر ہیں۔ اگرچہ میڈیا کی صہیونیت نوازی ظاہر و باہر ہے لیکن خود ناجائز صہیونی ریاست کے اندر سے خوف میں ڈوبی آوازیں بلند ہو رہی ہیں کہ ’’اب ہم محفوظ نہیں!‘‘ مجاہدینِ غزہ بھی بالآخر مجاہدین افغانستان کی طرح سرخرو ہوں گے‘ ان شاء اللہ العزیز! آج امتحان غزہ کے مسلمانوں کا نظر آ رہا ہے لیکن اصل آزمائش ایک بار پھر مسلمان ممالک کے حکمرانوں اور عوام کی ہے۔

❁❁❁

دورۂ ترجمۂ قرآن — ڈاکٹر اسرار احمد

سُوْرَۃُ الْبُرُوْجِ

تمہیدی کلمات

سورۃ البروج اور اس کے بعد والی سورت یعنی سورۃ الطارق کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے۔ اس سورت کی ابتدائی آیات میں ایک تاریخی واقعہ کا ذکر ہوا ہے جو یمن میں ۵۲۳ عیسوی کے لگ بھگ' حضور ﷺ کی ولادت سے تقریباً پچاس سال قبل پیش آیا۔ قدیم یمن میں بہت عرصہ تک عیسائی بادشاہ برسرِ اقتدار رہے۔ لیکن چھٹی صدی عیسوی کے آغاز کے زمانے میں وہاں 'ذونواس' نامی یہودی بادشاہ کی حکومت قائم ہوگئی جو عیسائیوں کا شدید مخالف تھا۔ یہودی اور عیسائی دراصل شروع ہی سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہے ہیں۔ ان کے باہمی اختلافات کی نوعیت ایسی ہے کہ اصولی طور پر ان کے درمیان کبھی بھی صلح نہیں ہوسکتی۔ ظاہر ہے عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا رسول مانتے ہیں بلکہ ان کی اکثریت تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتی ہے' جبکہ یہودی آپؑ کو مرتد' جادوگر اور ولدالزنا قرار دیتے ہیں (نعوذ باللہ)۔ ظاہر ہے ایسی صورتِ حال میں ان لوگوں کے باہمی اختلافات کیسے ختم ہوسکتے ہیں۔

البتہ آج کل اس حوالے سے بہت غیر معمولی صورتِ حال دیکھنے کو مل رہی ہے۔ آج پوری عیسائی دنیا یہودیوں کی مٹھی میں ہے اور عیسائیوں کی مدد سے انہوں نے یہودی ریاست بھی قائم کرلی ہے۔ اس کے علاوہ بھی وہ عیسائیوں کی معاشی اور جنگی طاقت کو جہاں اور جیسے چاہتے ہیں استعمال کررہے ہیں۔ یہ دراصل یہودی ذہانت اور محنت کا جادو ہے جو آج پوری دنیا کے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ اس غیر معمولی صورتِ حال کی وجوہات اور ممکنہ نتائج کے بارے میں میری تقاریر کی ریکارڈنگ موجود ہے۔ مزید معلومات کے لیے ان تقاریر سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ بہرحال یمن کے یہودی بادشاہ ذونواس نے عیسائی دشمنی کے جنون میں یہ کارنامہ سرانجام دیا کہ

باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت بڑی بڑی خندقیں کھدوا کر ان میں ایندھن بھرا اور پھر وسیع پیمانے پر آگ جلا کر بیس ہزار کے لگ بھگ بے گناہ عیسائیوں کو زندہ جلا دیا۔ اس سورت کی ابتدائی آیات میں اسی واقعہ کا ذکر ہے۔

یہ سورۂ مبارکہ مکّہ معظّمہ کے اُس دور میں نازل ہوئی جب کُفّارِ مکّہ مسلمانوں کو سخت سے سخت عذاب دے کر ایمان سے پھیر دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ چنانچہ اس میں کُفّار کو ان کے ظلم وستم کے بُرے انجام سے خبردار کیا گیا ہے اور اہلِ ایمان کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر وہ ان مظالم کے مقابلے میں ثابت قدم رہیں گے تو ان کو اس کا بہترین اجر ملے گا اور اللہ تعالیٰ ظالموں سے بدلہ ضرور لے گا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الۡبُرُوۡجِ ۙ﴿۱﴾ وَالۡیَوۡمِ الۡمَوۡعُوۡدِ ۙ﴿۲﴾ وَشَاہِدٍ وَّ
مَشۡہُوۡدٍ ؕ﴿۳﴾ قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ ۙ﴿۴﴾ النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ ۙ﴿۵﴾
اِذۡ ہُمۡ عَلَیۡہَا قُعُوۡدٌ ۙ﴿۶﴾ وَّ ہُمۡ عَلٰی مَا یَفۡعَلُوۡنَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ شُہُوۡدٌ ؕ﴿۷﴾
وَ مَا نَقَمُوۡا مِنۡہُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡا بِاللّٰہِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَمِیۡدِ ۙ﴿۸﴾ الَّذِیۡ
لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ وَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ
شَہِیۡدٌ ؕ﴿۹﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ فَتَنُوا الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتِ ثُمَّ لَمۡ
یَتُوۡبُوۡا فَلَہُمۡ عَذَابُ جَہَنَّمَ وَ لَہُمۡ عَذَابُ الۡحَرِیۡقِ ﴿ؕ۱۰﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ
اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَہُمۡ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ ۬ؕ
ذٰلِکَ الۡفَوۡزُ الۡکَبِیۡرُ ﴿ؕ۱۱﴾ اِنَّ بَطۡشَ رَبِّکَ لَشَدِیۡدٌ ﴿ؕ۱۲﴾ اِنَّہٗ ہُوَ
یُبۡدِئُ وَ یُعِیۡدُ ﴿ۚ۱۳﴾ وَ ہُوَ الۡغَفُوۡرُ الۡوَدُوۡدُ ﴿ۙ۱۴﴾ ذُو الۡعَرۡشِ
الۡمَجِیۡدُ ﴿ۙ۱۵﴾ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیۡدُ ﴿ؕ۱۶﴾ ہَلۡ اَتٰىکَ حَدِیۡثُ الۡجُنُوۡدِ ﴿ۙ۱۷﴾
فِرۡعَوۡنَ وَ ثَمُوۡدَ ﴿ؕ۱۸﴾ بَلِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فِیۡ تَکۡذِیۡبٍ ﴿ۙ۱۹﴾ وَّ اللّٰہُ مِنۡ
وَّرَآئِہِمۡ مُّحِیۡطٌ ﴿ۚ۲۰﴾ بَلۡ ہُوَ قُرۡاٰنٌ مَّجِیۡدٌ ﴿ۙ۲۱﴾ فِیۡ لَوۡحٍ مَّحۡفُوۡظٍ ﴿۲۲﴾

آیت ۱ ﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الۡبُرُوۡجِ ﴿۱﴾﴾ ”قسم ہے آسمان کی جو بُرجوں والا ہے۔“

بُرجوں سے مراد آسمان کے عظیم الشان ستارے اور سیارے لیے گئے ہیں۔

آیت ۲ ﴿وَالۡیَوۡمِ الۡمَوۡعُوۡدِ ۙ﴾ ''اور قسم ہے اُس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔''

یعنی قیامت کا دن‘ جو آ کر رہے گا۔

آیت ۳ ﴿وَشَاہِدٍ وَّمَشۡہُوۡدٍ ؕ﴾ ''اور قسم ہے حاضر ہونے والے کی اور اُس کی جس کے پاس حاضر ہوا جائے۔''

اس آیت کی بہت سی تعبیرات کی گئی ہیں‘ جن میں سے ایک تعبیر یہ ہے کہ شَاہِد سے مراد جمعہ کا دن ہے‘ جو شہر شہر بستی بستی لوگوں کے پاس حاضر ہوتا ہے‘ جبکہ مَشۡہُوۡد عرفہ (۱۰ ذی الحجہ) کا دن ہے جس کے پاس لوگوں کو خود میدانِ عرفات میں جا کر حاضر ہونا پڑتا ہے۔

آیت ۴ ﴿قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ ۙ﴾ ''ہلاک ہو گئے وہ کھائیوں والے۔''

''اصحاب الاخدود'' سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے خندقیں کھودیں اور اہلِ ایمان کو ان خندقوں میں ڈال کر جلایا۔ بظاہر تو وہاں اہلِ ایمان ہلاک ہوئے تھے‘ لیکن وہ تو اپنی جان‘ جان آفریں کے سپرد کر کے آخرت کی نعمتوں اور کامیابیوں کے مستحق ٹھہرے اور واقعتاً ہلاکت اور بربادی ان لوگوں کے حصّے میں آئی جنہوں نے خندقیں کھود کر اہلِ ایمان کو ان میں ڈال کر جلایا۔[1]

آیت ۵ ﴿النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ ۙ﴾ ''وہ آگ جو بڑی ایندھن والی تھی۔''

۱۔ مفتی محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ اپنے ''آسان ترجمۂ قرآن'' کی تشریحات میں ''اَصحابُ الاُخدود'' کے واقعہ کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

''مشہور تفسیر کے مطابق ان آیتوں میں ایک واقعے کی طرف اشارہ ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے صحیح مسلم کی ایک حدیث میں منقول ہے۔ اور وہ یہ کہ پچھلی کسی اُمّت میں ایک بادشاہ تھا جو ایک جادوگر سے کام لیا کرتا تھا۔ جب وہ جادوگر بوڑھا ہو گیا تو اُس نے بادشاہ سے کہا کہ میرے پاس کوئی لڑکا بھیج دیا کرو جسے میں جادو سکھاؤں‘ تاکہ میرے بعد وہ تمہارے کام آسکے۔ بادشاہ نے ایک لڑکے کو جادوگر کے پاس بھیجنا شروع کر دیا۔ یہ لڑکا جب جادوگر کے پاس جاتا تو راستے میں ایک عبادت گزار شخص کے پاس سے گزرتا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصلی دین پر تھا (ایسے شخص کو راہب کہتے تھے) اور توحید کا قائل تھا۔ یہ لڑکا اُس کے پاس بیٹھ جاتا اور اُس کی باتیں سنتا تھا جو اُسے اچھی لگتی تھیں۔ ایک دن وہ جا رہا تھا تو راستے میں ایک بڑا جانور نظر آیا جس نے لوگوں کا راستہ روکا ہوا تھا‘ (بعض روایتوں میں ہے کہ وہ جانور شیر تھا‘ ◄

یعنی وہ خوفناک آگ جسے بہت زیادہ ایندھن جمع کرکے بھڑکایا گیا تھا۔

آیت ۶ ﴿اِذۡ هُمۡ عَلَیۡهَا قُعُوۡدٌ ۙ﴿۶﴾﴾ ''جبکہ وہ اس (کے کناروں) پر بیٹھے ہوئے تھے۔''

آیت ۷ ﴿وَّ هُمۡ عَلٰی مَا یَفۡعَلُوۡنَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ شُهُوۡدٌ ؕ﴿۷﴾﴾ ''اور مؤمنین کے ساتھ وہ

◄ اور لوگ اُس سے ڈر رہے تھے) لڑکے نے ایک پتھر اُٹھایا' اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ یا اللہ! اگر راہب کی باتیں آپ کو جادوگر کی باتوں سے زیادہ پسند ہیں تو اس پتھر سے اس جانور کو مروا دیجیے۔ اب جو اُس نے پتھر اُس جانور کی طرف پھینکا تو جانور مر گیا' اور لوگوں کا راستہ کھل گیا۔ اس کے بعد لوگوں کو اندازہ ہوا کہ اس لڑکے کے پاس کوئی خاص علم ہے۔ چنانچہ ایک اندھے شخص نے اُس سے درخواست کی کہ اُس کی بینائی واپس آ جائے۔ لڑکے نے اُس سے کہا کہ شفا دینے والا تو اللہ تعالیٰ ہے' اس لیے اگر تم یہ وعدہ کرو کہ اللہ تعالیٰ کی توحید پر اِیمان لے آؤ گے تو میں تمہارے لیے اللہ تعالیٰ سے دُعا کروں گا۔ اُس نے یہ شرط مان لی۔ لڑکے نے دُعا کی تو اللہ تعالیٰ نے اُس کو بینائی عطا فرما دی' اور وہ توحید پر اِیمان لے آیا۔ ان واقعات کی خبر جب بادشاہ کو ہوئی تو اُس نے اُس نابینا کو بھی گرفتار کر لیا' اور لڑکے اور راہب کو بھی۔ اور ان سب کو توحید کے انکار پر مجبور کیا۔ جب وہ نہ مانے تو اُس نے اُس نابینا شخص اور راہب کو تو آرے سے چروا دیا' اور لڑکے کے بارے میں اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ اُسے کسی اونچے پہاڑ پر لے جا کر نیچے پھینک دیں۔ لیکن جب وہ لوگ لڑکے کو لے کر گئے تو اُس نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی' پہاڑ پر زلزلہ آیا جس سے وہ لوگ مر گئے' اور لڑکا زندہ رہا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اُسے کشتی میں لے جا کر سمندر میں ڈبو دیا جائے۔ لڑکے نے پھر دُعا کی' جس کے نتیجے میں کشتی اُلٹ گئی' وہ سب ڈوب گئے' اور لڑکا پھر سلامت رہا۔ بادشاہ جب عاجز آ گیا تو لڑکے نے اُس سے کہا کہ اگر تم مجھے واقعی مارنا چاہتے ہو تو اُس کا ایک ہی طریقہ ہے' اور وہ یہ کہ تم سب لوگوں کو ایک میدان میں جمع کر کے مجھے سولی پر چڑھاؤ' اور اپنے ترکش سے تیر نکال کر کمان میں چڑھاؤ' اور یہ کہو کہ: بِاسۡمِ اللهِ رَبِّ الۡغُلَامِ ''اُس اللہ کے نام پر جو اس لڑکے کا پروردگار ہے'' پھر تیر سے میرا نشانہ لگاؤ۔ بادشاہ نے ایسا ہی کیا' اور تیر اُس لڑکے کی کنپٹی پر جا کر لگا' اور اُس سے وہ شہید ہو گیا۔ لوگوں نے جب یہ نظارہ دیکھا تو بہت سے ایمان لے آئے۔ اس موقع پر بادشاہ نے اُن کو سزا دینے کے لیے سڑکوں کے کناروں پر خندقیں کھدوا کر اُن میں آگ بھڑکائی' اور حکم دیا کہ جو کوئی دینِ حق کو نہ چھوڑے' اُسے ان خندقوں میں ڈال دیا جائے۔ چنانچہ اس طرح ایمان والوں کی ایک بڑی تعداد کو زندہ جلا دیا گیا۔'' (صحیح مسلم' ح:۳۰۰۵)

جو کچھ کر رہے تھے خود اس کا نظارہ بھی کر رہے تھے۔‘‘

ان صاحبِ اقتدار و اختیار لوگوں نے اہلِ ایمان کو زندہ جلانے کے احکام جاری کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان خندقوں کے کناروں پر انہوں نے باقاعدہ براجمان ہو کر اس دلدوز منظر کا نظارہ کرنے کا اہتمام بھی کیا۔ اسی طرح پچھلی صدی میں ہٹلر نے بھی بہت ’’پُرتکلّف‘‘ منصوبہ بندی کے ساتھ یہودیوں کے قتلِ عام کا اہتمام کیا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے بڑے بڑے گیس چیمبرز نصب کیے اور انسانی لاشوں کو سائنٹیفک انداز میں ٹھکانے لگانے کے لیے نئے نئے طریقے ایجاد کیے۔

آیت ۸ ﴿وَمَا نَقَمُوۡا مِنۡهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَمِيۡدِ ۙ‏﴿۸﴾﴾ ’’اور وہ نہیں انتقام لے رہے تھے اُن سے مگر اس لیے کہ وہ ایمان لے آئے تھے اللہ پر جو زبردست ہے اور اپنی ذات میں خود ستودہ صفات ہے۔‘‘

آیت ۹ ﴿الَّذِىۡ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ﴾ ’’جس کے لیے بادشاہی ہے آسمانوں کی اور زمین کی۔‘‘

﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ شَهِيۡدٌ ؕ‏﴿۹﴾﴾ ’’اور اللہ تو ہر چیز پر خود گواہ ہے۔‘‘

آیت ۱۰ ﴿اِنَّ الَّذِيۡنَ فَتَنُوا الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ ثُمَّ لَمۡ يَتُوۡبُوۡا﴾ ’’یقیناً جن لوگوں نے ظلم و ستم توڑا مؤمن مَردوں اور مؤمن عورتوں پر پھر انہوں نے توبہ بھی نہیں کی‘‘

اگر ان میں سے کسی نے مرنے سے پہلے توبہ کر لی اور ایمان لے آیا تو اُس کا یہ جرم معاف ہو سکتا ہے۔

﴿فَلَهُمۡ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمۡ عَذَابُ الۡحَرِيۡقِ ؕ‏﴿۱۰﴾﴾ ’’تو ان کے لیے ہوگا جہنم کا عذاب اور جلا ڈالنے والا عذاب۔‘‘

آیت ۱۱ ﴿اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ’’یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے‘‘

﴿لَهُمۡ جَنّٰتٌ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ؕ﴾ ’’ان کے لیے وہ باغات ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔‘‘

﴿ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ﴿١١﴾﴾ ’’یہ ہے اصل بڑی کامیابی۔‘‘

آیت ۱۲ ﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ﴿١٢﴾﴾ ’’یقیناً تیرے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔‘‘

اللہ تعالیٰ حلیم بھی ہے‘ وہ انسان کو ڈھیل بھی دیتا ہے اور اس کی رسّی دراز بھی کرتا ہے (اللہ تعالیٰ کی اس صفت کا ذکر اگلی سورت میں آئے گا) لیکن جب وہ کسی فرد یا قوم کی گرفت کرتا ہے تو اس کی گرفت بہت سخت ہوتی ہے۔

آیت ۱۳ ﴿اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ﴿١٣﴾﴾ ’’وہی ہے جو پہلی مرتبہ پیدا کرتا ہے اور وہی اعادہ بھی کرے گا۔‘‘

جب اُس نے انسان کو پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے تو دوسری مرتبہ وہ اسے پیدا کرنے پر بھلا کیونکر قادر نہیں ہوگا؟

آیت ۱۴ ﴿وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ﴿١٤﴾﴾ ’’اور وہ بخشنے والا بھی ہے‘ محبّت کرنے والا بھی ہے۔‘‘

آیت ۱۵ ﴿ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ﴿١٥﴾﴾ ’’عرش کا مالک ہے‘ بڑی شان والا ہے۔‘‘

آیت ۱۶ ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿١٦﴾﴾ ’’وہ جو ارادہ کرلے‘ کر گزرنے والا ہے۔‘‘

ظاہر ہے اُس کے ارادے کے آگے کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔

آیت ۱۷ ﴿هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ﴿١٧﴾﴾ ’’کیا آپ کے پاس لشکروں کی خبر پہنچی ہے؟‘‘

آیت ۱۸ ﴿فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ ﴿١٨﴾﴾ ’’فرعون اور ثمود (کے لشکروں) کی؟‘‘

آیت ۱۹ ﴿بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ﴿١٩﴾﴾ ’’لیکن یہ کافر جو ہیں یہ جھٹلانے ہی میں لگے رہیں گے۔‘‘

آیت ۲۰ ﴿وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ ﴿٢٠﴾﴾ ’’جبکہ اللہ ان کو گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔‘‘

آیت ۲۱ ﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿٢١﴾﴾ ’’بلکہ یہ تو قرآن ہے بہت عزّت والا۔‘‘

آیت ۲۲ ﴿فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿٢٢﴾﴾ ’’لوحِ محفوظ میں (نقش ہے)۔‘‘

یعنی اصل قرآن مجید اللہ تعالیٰ کے پاس لوحِ محفوظ میں ہے۔ جس مقام کا ذکر یہاں لَوْحٍ مَّحْفُوْظ کے نام سے ہوا ہے‘ سورۃ الزخرف کی آیت ۴ میں اسے اُمُّ الْکِتٰب‘ سورۃ الواقعہ کی آیت ۷۸ میں کِتٰبٍ مَّکْنُوْن اور سورۂ عبس کی آیات ۱۳ اور ۱۴ میں اسے صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ مَّرْفُوْعَۃٍ مُّطَھَّرَۃٍ کہا گیا ہے۔ ۞

سُوْرَۃُ الطَّارِقِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

وَ السَّمَآءِ وَ الطَّارِقِ ۙ﴿۱﴾ وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا الطَّارِقُ ۙ﴿۲﴾ النَّجۡمُ
الثَّاقِبُ ۙ﴿۳﴾ اِنۡ کُلُّ نَفۡسٍ لَّمَّا عَلَیۡہَا حَافِظٌ ؕ﴿۴﴾ فَلۡیَنۡظُرِ الۡاِنۡسَانُ مِمَّ
خُلِقَ ؕ﴿۵﴾ خُلِقَ مِنۡ مَّآءٍ دَافِقٍ ۙ﴿۶﴾ یَّخۡرُجُ مِنۡۢ بَیۡنِ الصُّلۡبِ وَ
التَّرَآئِبِ ؕ﴿۷﴾ اِنَّہٗ عَلٰی رَجۡعِہٖ لَقَادِرٌ ؕ﴿۸﴾ یَوۡمَ تُبۡلَی السَّرَآئِرُ ۙ﴿۹﴾
فَمَا لَہٗ مِنۡ قُوَّۃٍ وَّ لَا نَاصِرٍ ؕ﴿۱۰﴾ وَ السَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجۡعِ ۙ﴿۱۱﴾ وَ
الۡاَرۡضِ ذَاتِ الصَّدۡعِ ۙ﴿۱۲﴾ اِنَّہٗ لَقَوۡلٌ فَصۡلٌ ۙ﴿۱۳﴾ وَّ مَا ہُوَ
بِالۡہَزۡلِ ؕ﴿۱۴﴾ اِنَّہُمۡ یَکِیۡدُوۡنَ کَیۡدًا ۙ﴿۱۵﴾ وَّ اَکِیۡدُ کَیۡدًا ﴿ۚۖ۱۶﴾ فَمَہِّلِ
الۡکٰفِرِیۡنَ اَمۡہِلۡہُمۡ رُوَیۡدًا ﴿ع۱۷﴾

آیت ۱ ﴿وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ﴿۱﴾﴾ ’’قسم ہے آسمان کی اور رات کو نمودار ہونے والے کی۔‘‘

آیت ۲ ﴿وَمَآ اَدۡرٰىکَ مَا الطَّارِقُ ﴿۲﴾﴾ ’’اور تم کیا جانتے ہو کہ وہ رات کو نمودار ہونے والا کیا ہے؟‘‘

آیت ۳ ﴿النَّجۡمُ الثَّاقِبُ ﴿۳﴾﴾ ’’وہ ستارہ ہے چمکدار۔‘‘

آیت ۴ ﴿اِنۡ کُلُّ نَفۡسٍ لَّمَّا عَلَیۡہَا حَافِظٌ ﴿۴﴾﴾ ’’کوئی جان ایسی نہیں جس پر کوئی نگہبان نہ ہو۔‘‘

سورۃ الانفطار کی ان آیات میں یہ مضمون زیادہ وضاحت کے ساتھ آیا ہے: ﴿وَاِنَّ عَلَیۡکُمۡ لَحٰفِظِیۡنَ ﴿۱۰﴾ کِرَامًا کَاتِبِیۡنَ ﴿۱۱﴾ یَعۡلَمُوۡنَ مَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴿۱۲﴾﴾ ’’جبکہ ہم نے تمہارے

اوپر محافظ (فرشتے) مقرر کر رکھے ہیں۔ بڑے باعزّت لکھنے والے۔ وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کر رہے ہو‘‘۔ انسان کے محافظ فرشتوں کا ذکر سورۃ الانعام کی اس آیت میں بھی ہے: ﴿وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ؕ﴾ (آیت ۶۱) ’’اور وہ اپنے بندوں پر پوری طرح غالب ہے اور وہ تم پر نگہبان بھیجتا رہتا ہے‘‘۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے ساتھ متعدد فرشتے مقرر کر رکھے ہیں۔ ان میں سے کچھ اس کے اعمال کا ریکارڈ مرتّب کرنے میں مصروف ہیں جبکہ کچھ کو اس کی حفاظت کی ذِمّہ داری سونپی گئی ہے۔

آیت ۵ ﴿فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۵﴾ ’’تو انسان کو غور کرنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔‘‘

آیت ۶ ﴿خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۶﴾ ’’وہ پیدا کیا گیا ہے اُچھلتے ہوئے پانی سے۔‘‘

آیت ۷ ﴿يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ۷﴾ ’’جو نکلتا ہے پیٹھ اور پسلیوں کے درمیان سے۔‘‘

مرد کے مادہ منویہ کا اصل منبع ریڑھ کی ہڈی اور پسلیوں کے درمیان ہے۔ یہاں سے پیدا ہو کر یہ مادہ ان غدودوں تک پہنچتا ہے جو اس کے لیے مخصوص ہیں۔

آیت ۸ ﴿اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ۸﴾ ’’یقیناً وہ اسے لوٹانے پر بھی قادر ہے۔‘‘

جس اللہ نے پانی کی ایک بوند سے انسان کی تخلیق کی ہے وہ یقیناً اس پر بھی قادر ہے کہ جب چاہے اسے اپنے پاس واپس بلا لے۔ اور یقیناً وہ اس کے مرنے کے بعد اسے دوبارہ زندہ کر دینے پر بھی قدرت رکھتا ہے۔

آیت ۹ ﴿يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۹﴾ ’’جس دن تمام چھپے ہوئے رازوں کی جانچ پڑتال ہو گی۔‘‘

آیت ۱۰ ﴿فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ۱۰﴾ ’’تو نہیں ہو گی کسی انسان کے لیے کوئی طاقت اور نہ ہو گا اس کا کوئی مددگار۔‘‘

آیت ۱۱ ﴿وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۱۱﴾ ’’قسم ہے اس آسمان کی جو بارش برساتا ہے وقفے وقفے سے۔‘‘

آیت ۱۲: ﴿وَالۡاَرۡضِ ذَاتِ الصَّدۡعِ ﴿۱۲﴾﴾ ’’اور قسم ہے اس زمین کی جو پھوٹ پڑتی ہے۔‘‘

آسمان سے بارش ہوتی ہے اور بارش کی وجہ سے نباتات زمین کو پھاڑتے ہوئے اُگ آتے ہیں۔ یعنی آسمان اور زمین اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ:

آیت ۱۳: ﴿اِنَّہٗ لَقَوۡلٌ فَصۡلٌ ﴿۱۳﴾﴾ ’’یہ (قرآن) قولِ فیصل ہے۔‘‘

آیت ۱۴: ﴿وَّمَا ہُوَ بِالۡہَزۡلِ ﴿۱۴﴾﴾ ’’اور یہ کوئی ہنسی مذاق نہیں ہے۔‘‘

جیسے سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا: ﴿وَبِالۡحَقِّ اَنۡزَلۡنٰہُ وَبِالۡحَقِّ نَزَلَ ؕ﴾ (آیت ۱۰۵) ’’اور اس (قرآن) کو ہم نے حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور یہ حق کے ساتھ نازل ہوا ہے۔‘‘

آیت ۱۵، ۱۶: ﴿اِنَّہُمۡ یَکِیۡدُوۡنَ کَیۡدًا ﴿۱۵﴾ وَّاَکِیۡدُ کَیۡدًا ﴿۱۶﴾﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) یہ لوگ اپنی سی چالیں چل رہے ہیں اور میں بھی اپنی چال چل رہا ہوں۔‘‘

آیت ۱۷: ﴿فَمَہِّلِ الۡکٰفِرِیۡنَ اَمۡہِلۡہُمۡ رُوَیۡدًا ﴿۱۷﴾﴾ ’’تو آپؐ ان کافروں کو ذرا مہلت دے دیجیے‘ تھوڑی دیر انہیں (ان کے حال پر) چھوڑ دیجیے!‘‘

ابتدائی مکی دور کی سورتوں میں حضور ﷺ کے لیے یہ ہدایت بہت تکرار کے ساتھ آئی ہے کہ آپؐ ان لوگوں کے لیے جلدی نہ کریں‘ ان کے بارے میں تھوڑی دیر انتظار کریں: ﴿فَاصۡبِرۡ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الۡعَزۡمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسۡتَعۡجِلۡ لَّہُمۡ ؕ﴾ (الاحقاف:۳۵) ’’تو (اے محمد ﷺ!) آپ بھی صبر کیجیے جیسے اولوالعزم رسولؑ صبر کرتے رہے ہیں اور ان کے لیے جلدی نہ کیجیے!‘‘ اس دور میں چونکہ مشرکینِ مکّہ نے اہلِ ایمان پر عرصۂ حیات تنگ کیا ہوا تھا‘ اس لیے ان آیات کے ذریعے حضور ﷺ کی وساطت سے اہلِ ایمان کو بھی بار بار تسلی دی جاتی تھی اور سمجھایا جاتا تھا کہ ابھی ہم ان لوگوں کو کچھ مزید مہلت دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ آپ لوگ ان کی طرف سے پہنچنے والی تکالیف پر صبر کرتے ہوئے ہمارے فیصلے کا انتظار کریں۔ ❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ: فی ذمۃ اللہ

محمد زکریا خان

آپ کو اگر ڈاکٹر صاحب کی رہائش گاہ پر جانے کا اتفاق ہو تو ایک چیز جو اس نابغۂ روزگار ہستی کے مکان کے در و دیوار سے چھلکتی ہوئی آپ محسوس کریں گے وہ ہے سادگی۔ صاحب خانہ کے دل کی طرح! یہاں ''سیٹ'' نام کا کوئی تکلف نہیں ملے گا۔ فرانس کا واٹر سیٹ' ماربل کا ڈنر سیٹ' ٹی سیٹ' فلاں سیٹ۔ ڈاکٹر صاحب کی ہستی ایک ہی انمول سیٹ سے عبارت تھی: بندگی رب' دعوت و تبلیغ اور اقامتِ دین۔

عمر بھر کوئی جائیداد نہ بنائی۔ لاہور کے علاقے کرشن نگر میں ایک رہائشی مکان تھا جسے بیچ کر ماڈل ٹاؤن میں ایک مکان بنایا' وہ بھی زندگی ہی میں اولاد کے نام کر گئے۔ نامۂ اعمال میں ایک ہی چیز ساتھ لے گئے: اسلام! بینک والے ہمیشہ کڑھتے ہی رہے کہ چند روپوں کے لیے وہ اکاؤنٹ کو آخر کیوں برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ روپیہ نہ پیسہ' جائیداد نہ بینک بیلنس' شیئرز نہ کاروباری شراکت۔ کہنے کو ڈاکٹر تھے' وہ بھی کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج سے فارغ التحصیل۔ پریکٹس کی مگر دل کو قرار نہ آیا۔ فرماتے تھے جس خدا کے دین کی عبادت اور دعوت کے لیے انسان پیدا ہوا ہے یہ اس میں مانع ہے۔ معاشی مصروفیات سے تھک ہار کر مَیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے کلام سے بھلا کیا اخذ کر پاؤں گا! کتاب اللہ کو ہاتھ لگانا ہے تو بھرپور توانائی کے ساتھ لگاؤ۔ قرآن کے ساتھ یہی عقیدت آپ کو تنظیم کے وابستگان میں بھی نظر آئے گی۔ ایک دو نہیں سینکڑوں نے خدا کے دین کے لیے اپنے آپ کو وقف کیا۔

رائج الوقت سیاست میں کبھی حصہ نہ لیا۔ اسے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا کھیل سمجھتے تھے اور اسلامی انقلاب میں بڑی رکاوٹ۔ اس لیے ہمیشہ سیاست سے کنارہ کش رہے' سوائے وہ دو ماہ جو جنرل ضیاء الحق کی مجلس شوریٰ میں گزارے۔ اسی دور میں انہیں مرکزی وزارت کی پیش کش بھی کی گئی تھی۔ ضیاء الحق کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا یہ حسنِ ظن تھا' جو جلد ہی غلط

ثابت ہوا‘ کہ وہ نیک نیت ہیں اور دینِ اسلام کے لیے کام کرنے میں سنجیدہ ہیں۔

میٹرک کے طالب علم کی ہستی ہی کیا ہوتی ہے: کھلنڈرا پن‘ بے پروائی‘ ہنسی مذاق۔ مگر یہاں بلا کی سنجیدگی تھی۔ ڈسپلن اور اسلامی بنیادی علوم کا گھر میں والد صاحب کی زیر نگرانی اہتمام۔ میٹرک میں ہی ’’پاکستان کا مطلب کیا؟‘‘ کے ایسے کارکن بنے کہ عمر بھر پھر اسی کے لیے جدّوجُہد کرتے رہے۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی رکنیت اختیار کی تو اسی لیے۔ مگر یہاں تو صرف وڈیراشاہی تھی۔ علامہ اقبال کے بعد مولانا مودودی کی آواز نے بہت جلد اس ہونہار طالب علم کو اپنی طرف مائل کرلیا۔ فیڈریشن چھوڑ کر اسلامی جمعیت طلبہ کی رکنیت اختیار کر لی۔ تقسیم ہند کے بعد اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے محض محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً آگ اور خون کا دریا پار کر کے اپنے پیارے پاکستان پہنچے۔ بیس دن مسلسل پیدل سفر۔ خوف و ہراس اور ۱۷۰ میل کی مسافت۔

یہاں خواب تو چکنا چور ہوئے لیکن نوجوانوں کو ایک اَن تھک قائد ضرور میسّر آ گیا۔ یہاں جو نا امیدی دیکھی گئی‘ اس کا اثر آپ کی زندگی میں بہت نمایاں تھا‘ خصوصاً آخری ایام میں۔

پاکستان کا مسئلہ کیا ہے؟ کرپشن‘ بدعنوانی‘ اقربا پروری‘ نوکر شاہی‘ اشرافیہ کی اجارہ داری‘ مارشل لاء۔ مگر ڈاکٹر صاحب کا ایک ہی جواب تھا: قرآن سے دوری! یہاں تک فرماتے تھے کہ اپنی بداعمالیوں اور اللہ تعالیٰ سے کیے گئے عہد سے بے اعتنائی برتنے کی وجہ سے مَغۡضُوۡب عَلَیۡہِمۡ کا مصداق یہودیوں کی بجائے آج کے مسلمان ہیں۔ دین اسلام کے احیاء کے لیے اپنی جوانی تج دی۔ شب و روز کا مشغلہ صرف قرآن اور قرآن فہمی رہا۔ سینکڑوں کو قرآن کے ساتھ شعوری طور پر جوڑا۔ صاحبِ علم وفکر اور انجمن ساز۔ دوسروں کو قائل کرنے کی غیر معمولی صلاحیت۔ جب خطاب کریں تو عامی اور اعلیٰ تعلیم یافتہ سب یکساں سمجھ لیں۔ پنڈال میں ایسی خاموشی اور سنجیدگی جیسے سروں پر پرند بیٹھے ہوں۔ رعب دار اور گرج دار آواز۔ کوئی ابہام نہیں‘ کوئی پیچیدگی نہیں۔ الفاظ کا بہترین چناؤ‘ اشعار کا برمحل انتخاب‘ بے ساختگی‘ تصنّع اور بناوٹ سے پاک‘ زیروبم مناسب اور موزوں۔ آخری دم تک گلا صاف رہا اگرچہ کمر کا عارضہ کمر توڑ ثابت ہوا۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنّت نصیب فرمائے‘ ایک عہد ساز شخصیت تھے۔ اسلامی جمعیت طلبہ کی نظامت علیا ہو‘ تنظیم اسلامی کی امارت ہو یا آخری ایام میں تنظیم کی سرپرستی کا زمانہ‘ ان کی ایک ہی لگن اور جستجو تھی کہ ہر مسلمان ربّ کی عبادت کرنے والا بن

جائے۔ دین اسلام کا داعی اور مبلغ بنے اور اقامتِ دین کا فریضہ انجام دے۔ پاکستان کی تاریخ میں معدودے چند ایسے لوگ ہوں گے جنہوں نے جوانی تا ادھیڑ عمر اور پھر پیرانہ سالی میں اپنے نصب العین سے سرِ مو انحراف نہ کیا ہو۔ کون ہے جس پر بدلتے حالات اثر انداز نہ ہوئے ہوں‘ پھر بیسویں صدی اور اس سے کہیں بڑھ کر اکیسویں صدی جو ہے ہی بنیادی تصورات اور عقائد میں تبدیلیوں کا زمانہ۔ اس بے وفا دور میں ایسے وفادار!

مولانا مودودی سے ڈاکٹر اسرار احمد کی جس قدر شدید محبت اور عقیدت تھی وہ سب کو معلوم ہے۔ اسلامی جمعیت طلبہ میں شمولیت سے ماچھی گوٹھ (۱۹۵۷ء) میں مولانا سے اختلاف تک ان کی ساری جوانی اسلامی جمعیت طلبہ اور جماعت اسلامی کے لیے وقف رہی۔ جن ایام میں طالب علم سے کہا جاتا ہے کہ اپنا ’’کیریئر‘‘ بنالو‘ اُن دنوں ڈاکٹر اسرار آخرت میں کیریئر بنانے کے لیے فکر مند رہے۔ جمعیت کے لیے دن رات کام کیا۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایک طالب علم جو اسلامی جمعیت طلبہ کے لیے ہی جیتا ہے اور صرف اسی کے لیے سوچتا ہے‘ اپنی تعلیمی ڈگری بھی مکمل کر لیتا ہے۔ مولانا مودودی نے ہندوستان سے کیسے کیسے ہیرے نکال لیے تھے‘ ڈاکٹر اسرار احمد اس کی ایک مثال ہیں۔ ان کے من میں ایک ہی لگن سمائی رہی کہ دعوت وتبلیغ اور اقامتِ دین کی جدّ وجُہد برابر جاری رہے۔ علامہ اقبال اگر اس نوجوان مسلم کو دیکھتے تو ضرور اپنی شاعری کی تعبیر قرار دیتے۔

مولانا مودودی سے محبت وعقیدت اور جماعت کے لیے لازوال خدمات اس امر میں مانع نہ ہوئیں کہ جسے وہ حق سمجھیں اس کے لیے پھر انسانی رشتہ و پیوند کو قربان نہ کر سکیں۔ جماعت اسلامی کا پاکستان کے انتخابات میں شمولیت کا فیصلہ صرف ڈاکٹر اسرار احمد کے لیے ہی ناقابلِ فہم نہ تھا بلکہ جماعت کی اور بھی اہم شخصیات اس کے بعد جماعت سے الگ ہوگئی تھیں۔ البتہ جتنا صدمہ ڈاکٹر اسرار کو ہوا‘ شاید ہی کسی کو ہوا ہو۔

جماعت سے علیحدگی کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۲ء تک تن تنہا کام کیا۔ حج کی سعادت حاصل کرتے ہوئے (۱۹۷۱ء میں) اپنے آپ سے عہد کیا کہ دین کے کام کے لیے ہمہ وقت فراغت حاصل کر لیں گے۔ فرماتے ہیں کہ اس دن سے میرے وقت کا ایک ایک لمحہ اور میری قوت و صلاحیت کا ایک ایک شمہ محض دین کی خدمت کے لیے صرف ہوا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی قائم ہوئی‘ اُس

اعلیٰ مقصد کے لیے جسے وہ سمجھتے تھے کہ انتخابی طریقے سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ جماعت اسلامی کے انتخابی سیاست میں شمولیت کے فیصلے کے بعد اس بات کا امکان تھا کہ دعوتی اور تحریکی عمل کے لیے وہ توجہ اور وقت میسر نہیں آ پائے گا جو صدیوں سے منتشر الخیال قوم کو علم و عمل پر مجتمع کرنے کے لیے چاہیے۔ اس زاویے سے دیکھا جائے تو تنظیم اسلامی درحقیقت جماعت ہی کے مشن کو لے کر آگے بڑھی۔

برصغیر میں قرآن مجید مدتوں طاقِ نسیان کی زینت رہا۔ خوش نما غلافوں میں لپٹا لپٹایا' یا پھر گلے کا تعویذ۔ خانقاہی ملاؤں نے عام آدمی کے لیے قرآن فہمی کا دروازہ بند کر رکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے جب قرآن پر ملاؤں کی اجارہ داری ختم کرنے کے کٹھن کام کا آغاز کیا تو ان کی شدید مخالفت ہوئی مگر وہ یک سوئی سے اپنے مشن پر کاربند رہے۔ آج تنظیم کے نوجوان بڑی بے ساختگی سے قرآن مجید پڑھنے پڑھانے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ ایک تحریک ہے جو پھیلتی چلی جا رہی ہے۔ اب ہمارا نوجوان قرآن سے فہم لینے سے نہیں گھبراتا۔

ڈاکٹر صاحب نے جس نقطہ نظر کو درست سمجھا' اس پر تن دہی سے کام کیا۔ اپنی ذات اور اپنے خاندان کو اس میں شامل کیا۔ ہر فورم کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا۔

پچھلی صدی عالَمِ اسلام میں تحریکوں کے جنم لینے کی صدی ہے۔ ہندوستانی تحریکوں میں جماعت اسلامی' تبلیغی جماعت اور دیوبند کی تحریکیں ہمہ گیر اور دُور رس ثابت ہوئی ہیں۔ ان بانی اداروں سے پھر اور تحریکوں نے جنم لیا جن کا مقصد اُس خلا کو پُر کرنا تھا جو کہیں نہ کہیں رہ ہی جاتا ہے۔ اگر جماعتیں بنتی رہی ہیں تو ہندوستان کو چیلنج بھی ایک قسم کا نہیں تھا۔ عقائد کی خرابیاں' ایمان کے مفہوم میں اجنبی فلسفے' بدعات' خرافات' بدعملی' منہج اہل سنت میں ابہام' منہج تلقی کا فقدان اور وحدتِ اُمت کے تصور سے دوری تو ہماری اپنی اندر کی خرابیاں تھیں۔ اس پر مستزاد استعمار کے لائے ہوئے نئے نئے ازم۔ ہندوستان میں ان سب سے نبرد آزما ہونے کے لیے ایک یا چند تحریکیں ناکافی تھیں۔ اس لیے اگر یہاں متعدد تحریکیں پائی گئی ہیں تو یہ برصغیر کے فکری اور منہج کے الجھاؤ کی وجہ سے ایک طبعی عمل ہے۔ تنظیم اسلامی کو ہم اسی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ شیطان کی البتہ چال یہ ہے کہ وہ مختلف طریقوں سے کام کرنے والی تحریکوں کو باہم متصادم کر دے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے جس اعلیٰ مقصد کے لیے تنظیم بنائی تھی اس کی بھی برصغیر میں ضرورت

ہے۔تبھی تو انہیں پاکستان سے باہر خصوصاً ہندوستان میں بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ہم سمجھتے ہیں کہ برصغیر میں اہلِ سُنّت والجماعت کی مختلف تحریکیں اور تنظیمیں ایک ہی کام کو مکمل کر رہی ہیں اور وہ ہے یہاں کے مسلمانوں کو شعوری طور پر بیدار کرنا تا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات پر اپنے آپ کو اور اپنے معاشرے کو ڈھال سکیں۔اس قاعدے کی رو سے ایک عام مسلمان کا کسی اسلامی تنظیم میں شامل ہونا اقامتِ دین کی جِدّ وجُہد کو آگے بڑھانے کا باعث ہے۔

''تنظیم اسلامی'' بھی اہلِ سُنّت والجماعت کی ایک نمائندہ جماعت ہے۔یہ جاہلانہ رسوم و رواج کا رد کرتی ہے۔عام مسلمان کو قرآن مجید سے جوڑتی ہے۔پاکستان میں شریعتِ محمدیؐ کے نفاذ اور خلافت کے قیام کے لیے شبانہ روز محنت کرتی ہے۔اپنے رفقاء میں انکساری اور ڈسپلن پیدا کرتی ہے۔انہیں اپنے دائرۂ اختیار میں دین کے نفاذ کا درس دیتی ہے۔انہیں انفاق فی سبیل اللہ کرنا سکھاتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی رحلت کے ساتھ اُس کہانی کا ایک اور باب اپنے اختتام کو پہنچا جس کے سرخیل شاہ ولی اللہ دہلویؒ تھے۔دین کو خانقاہوں سے نکال کر معاشرے کی حقیقت بنانے کا مبارک کام جن شخصیات نے کیا تھا' اس سلسلے کی آخری کڑی ڈاکٹر اسرار احمد تھے۔اس سلسلۂ فکر کی یہ کڑی اپنا فرض نبھا کر باقی کا کام آنے والوں کے لیے چھوڑ کر اپنے ساتھیوں سے جا ملی ہے۔ناتوانی میں بھی اس قافلہ خیر و برکت کو کیا ہی اچھے حدی خواں ملے تھے! اب اس قافلے کو اور بھی سبک رفتاری سے چلنا ہے! ایک نئے جذبے اور نئے آہنگ کے ساتھ! عمل کو علم سے اور تحریک کو دعوت سے برآمد کرتے ہوئے۔ ڈاکٹر اسرار احمد کی زندگی نوجوانوں کے لیے ایک نمونہ ہے۔ایک ایسا کردار جو تعلیم کے ساتھ تحریک کے تقاضوں کو نبھانا بھی جانتا تھا۔جو حق کے لیے جیا' حق پر رہا اور حق پر مرا۔(ولا نزکّی علی اللّٰہ احدًا)

خدایا! ان کی قبر کو روضۃ من ریاض الجنۃ بنا۔ان کے اہل خانہ کو صبر کی توفیق عطا فرما۔تنظیم کی موجودہ قیادت کو توفیق دے کہ وہ اسے اس کے نصب العین کے مطابق چلا سکیں۔ڈاکٹر صاحب نے اقامتِ دین کی جو کوشش کی' اسے قبول فرما۔اس کی تکمیل فرما۔تمام مسلمانوں کو امر بالمعروف میں متحد فرما' نہی عن المنکر کے خاتمے کے لیے قوت عطا فرما۔آمین!

(یہ مضمون ڈاکٹر صاحبؒ کے انتقال پُرملال کے بعد سہ ماہی ''ایقاظ'' جولائی تا ستمبر 2010ء لاہور میں شائع ہوا تھا' جسے قدرے ایڈیٹنگ کے بعد میثاق میں شائع کیا جا رہا ہے۔)

اسرائیلی ریاست
اور
سورۃ الاسراء کی ابتدائی آیات

زین العابدین ☆

بنواسرائیل وہ قوم ہے جنہیں اپنے دور میں دنیا کی افضل ترین قوم کا درجہ حاصل تھا۔ یہ انبیائے کرام ﷩ کی اولاد تھی۔ ان میں کثرت سے انبیاء ورسل تشریف لائے‘ لیکن ان کا رویہ انبیاء کرام ﷩ کے ساتھ ہمیشہ منفی رہا۔ بار بار اللہ کے برگزیدہ پیغمبروں کی گستاخیاں کیں‘ اُن کی تکذیب کی بلکہ اُنہیں قتل کیا‘ زمین میں فساد پھیلایا اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی‘ جس کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے ان پر ذلت ومسکنت کا ٹھپا لگایا‘ جو قیامت تک ان پر لگا رہے گا۔

اس ذلت ومسکنت کا مظاہرہ صدیوں سے ہو رہا تھا‘ جب سے یہ دربدر پھر رہے تھے۔ کوئی قوم انہیں مستقل اپنے ساتھ نہیں رہنے دیتی تھی‘ البتہ مسلمانوں نے ہمیشہ ان کے ساتھ رواداری کا معاملہ کیے رکھا۔ یہ آستین کے سانپ کی مانند اپنے ہی خواہوں کو ہی ڈستے رہے‘ تا آنکہ خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے بعد انہوں نے اپنے لیے ’’اسرائیل‘‘ کے نام سے فلسطین کی مقدس سرزمین پر ایک یہودی ریاست قائم کی۔

ذلت ومسکنت کی چھاپ ان سے پھر بھی علیحدہ نہیں ہوئی‘ اور یہودی ریاست کے قیام کے باوجود رسوائی ہمیشہ ان کا مقدر رہی۔ فلسطینی مسلمانوں پر ظلم کی وجہ سے اقوامِ عالم نے انہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھا‘ لیکن چونکہ مغرب اور عالمِ اسلام کی حکومتیں ان سے خائف تھیں اس لیے انہیں ایک طرح کی برتری حاصل رہی۔ اپنی سازشوں کے بل بوتے پر یہ امریکہ اور یورپ کی اقتصادیات اور سیاست پر ایسے حاوی ہو گئے جس کی وجہ سے بعض حضرات کے ذہن میں یہ اشکال پیدا ہوا کہ قرآنی وعدہ تو ان پر غضب اور ذلت کا ہے جبکہ موجودہ صورتِ حال اس کے

☆ فاضل جامعہ دار العلوم کراچی و مدرس جامعہ دار العلوم‘ بڈھ بیر‘ پشاور

خلاف ہے! حقیقت یہ ہے کہ یہود کی ذلت و مسکنت بھی خدا کی طرف سے طے شدہ ہے اور اُمّتِ مُسلمہ کے دور میں بالخصوص آخری زمانے میں ان کے علو اور برتری کا بھی خدائی وعدہ ہے جو یقیناً پورا ہو کر رہے گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ دونوں حالتیں بیک وقت کیسے اکٹھی ہو سکتی ہیں!

دو مرتبہ کا فساد اور عظیم بالا دستی

سورۃ الاسراء جس کا ایک نام سورۃ بنی اسرائیل بھی ہے‘ اللہ تعالیٰ نے اس کے شروع میں ہی یہود کا تذکرہ کیا ہے:

﴿وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا ④﴾

’’اور ہم نے کتاب میں فیصلہ کر کے بنو اسرائیل کو اس بات سے آگاہ کر دیا تھا کہ تم زمین میں دو مرتبہ فساد مچاؤ گے‘ اور بڑی بلندی حاصل کرو گے۔‘‘

یعنی یہودی دو مرتبہ زمین میں فساد پھیلائیں گے‘ اور انہیں زمین میں عظیم ترقی اور بالا دستی نصیب ہوگی۔ دو مرتبہ فساد پھیلانے پر یہودیوں کو سزا دینے کا بھی تذکرہ موجود ہے۔ فساد کا ذکر دو مرتبہ ہے جبکہ بلندی کا تذکرہ ایک بار ہے۔ یہ بالا دستی غلبے کی صورت میں ہوگی۔ یہ بات بھی آیات کے سیاق سے اور طرز سے معلوم ہوتی ہے کہ یہ غلبہ مقامِ مدح میں نہیں بلکہ ذم میں ہے۔ علّامہ ماتریدی رحمہ اللہ اپنی تفسیر ’’تاویلات اہلِ سُنّت‘‘ میں فرماتے ہیں:

وقيل لتقهرنّ ولتَعلُنَّ غَلَبَةً كقوله:﴿اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ﴾ (القصص:٤) أي قَهَرَ و غَلَبَ. ألا ترى أنه قال: ﴿ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَاۗىِٕفَةً مِّنْهُمْ﴾(القصص:٤) ثَبَتَ أنَّه على الغلبة والقهر.

(تفسير ماتريدي)

’’کہا گیا ہے کہ تم غالب اور بالا دست بنو گے‘ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد فرعون کے بارے میں ہے کہ ’’بے شک فرعون زمین میں بالا دست بن گیا تھا‘‘ اس طرح اس میں بھی غور کریں کہ آگے اللہ تعالیٰ نے فرعون کے بارے میں فرمایا کہ: ’’اُس نے لوگوں کو گروہ در گروہ بنایا‘ کہ ان میں ایک گروہ کو کمزور کرنا چاہتا تھا‘‘۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اس آیت میں ’’علوّ‘‘ سے مراد غلبہ ہی ہے۔‘‘

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دو مرتبہ کا فساد کب اور زمین کے کون سے حصے میں پھیلا؟

اللہ نے انہیں اس کی سزا کب دی؟ حالانکہ یہودیوں نے ہمیشہ فساد پھیلایا ہے‘ اور انبیاء ؊ کے قتل سے بڑا فساد اور کیا ہوگا! یہودیوں نے جنگوں کی آگ بھڑکانے کی کوششیں کی ہیں‘ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ؀﴾ (المائدۃ)

’’جب کبھی یہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ اسے بجھا دیتا ہے‘ اور یہ زمین میں فساد مچاتے پھرتے ہیں‘ جبکہ اللہ فساد مچانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔‘‘

ان جرائم کی سزا میں یہودی سینکڑوں سال سے زمین میں دربدر پھر رہے تھے اور ان پر ہمیشہ کوئی نہ کوئی طاقت مسلط ہوتی رہی ہے‘ جیسا کہ سورۃ الاعراف میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْۗءَ الْعَذَابِ ۭ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ښ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ؁﴾ (الاعراف)

’’اور جب تمہارے ربّ نے اعلان کیا کہ وہ ان پر قیامت کے دن تک کوئی نہ کوئی ایسا شخص مسلط کرتا رہے گا جو ان کو بری تکلیفیں پہنچائے گا۔ بے شک تمہارا ربّ جلد سزا دینے والا ہے‘ اور یقیناً وہ بہت بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔‘‘

ان کی تاریخ زیادہ تر بیت المقدس کے گرد گھومتی ہے۔ وہاں جب یہودیوں کی پہلی سلطنت قائم ہوئی تو بعثتِ نبوی تک یہ شہر متعدد بار تاراج ہوا۔ اس کا مال و دولت لوٹا گیا۔ عورتوں اور بچوں کو قتل کیا گیا۔ یہودیوں کو تہ تیغ کیا گیا۔ دو مرتبہ یہ مکمل طور پر برباد ہوا‘ ۲۳ بار اس کا محاصرہ ہوا‘ ۵۲ مرتبہ یہ مختلف حملہ آوروں کا نشانہ بنا‘ اور یہ سب یہودیوں کی بداعمالی کی بدولت ہوا۔ انہوں نے جب بھی سچی توبہ کی‘ بیت المقدس انہیں واپس ملا اور جب اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں کیں تو انہیں بیت المقدس سے نکالا گیا۔ البتہ دو مواقع ایسے ہیں جب انہوں نے فساد پھیلایا اور یہاں خوب تباہی پھیلی‘ جنہیں عموماً مفسرین نے اسی آیت کی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔

۵۸۷ ق م میں یہودیوں کی بار بار کی شرارت پر بخت نصر (Nebuchadnezzar) نے یروشلم پر حملہ کر کے اسے تاراج کر دیا۔ یہودیوں کا قتلِ عام کیا۔ یروشلم کی گلیوں میں خون کی ندیاں بہ نکلیں۔ اُس نے ہیکل سلیمانی کو جلا دیا اور شہر کو زمین کے برابر کر دیا۔ مالِ غنیمت اور بچے کھچے یہودیوں کو اپنے ساتھ بابل لے گیا‘ جن کی تعداد پچاس ہزار بتائی جاتی ہے۔

یہ یہود کی پہلی تباہی تھی۔ اس تباہی میں نہ صرف ہیکل سلیمانی کا نشان مٹ گیا بلکہ دیگر صحائف کے ساتھ تورات اور تابوتِ سکینہ بھی غائب ہوگیا۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ بابل میں یہودی غلاموں کو دریائے فرات کے کنارے آباد کیا گیا اور انہوں نے اس بستی کا نام ''تل ابیب'' رکھا۔ اسرائیل کا موجودہ دارالحکومت ''تل ابیب'' اسی دور کی یاد تازہ کرتا ہے۔

اس کے بعد فارسیوں نے عراق، شام اور بابل پر قبضہ کیا تو ۵۳۹ ق م میں ایرانی حکمران ''کوروش'' (Cyrus) نے یہودیوں کو یروشلم جانے کی اجازت دی۔ تقریباً ۵۰ ہزار یہودی بیت المقدس آ گئے جبکہ اکثر عراق (بابل) ہی میں رہ گئے۔

۶۶ء میں رومی سلطنت کے خلاف یہودیوں کی بغاوت کی وجہ سے انہیں تھوڑے عرصے کے لیے آزادی مل گئی، لیکن یہ بغاوت ناکام ہوگئی، اور ۷۰ء میں رومی حکمران طیطس (Titus) نے بیت المقدس پر حملہ کر کے یہودی بغاوت کو کچل دیا۔ ہیکل سلیمانی دوسری مرتبہ جل کر راکھ ہوگیا۔ ایک لاکھ سے زائد یہودی قتل ہوئے اور ایک لاکھ کے قریب غلام بنائے گئے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان آیات میں پہلے وعدے سے مراد بخت نصر کی طرف سے مسلط ہونے والی تباہی ہے اور وَعۡدُ الۡاٰخِرَۃِ سے مراد رومی بادشاہ ٹائٹس کی چڑھائی ہے جس نے مسجد (ہیکل) بلکہ پورے شہر کو تباہ کر دیا تھا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں نہیں، بلکہ یہود کے فساد پھیلانے اور ترقی کرنے کے ان وعدوں کا تعلق اس اُمّت سے ہے کیونکہ رسولِ اکرم ﷺ کی بعثت سے پہلے انہوں نے متعدد مرتبہ فساد پھیلایا، جس کی سزا انہیں دی گئی اور اس جگہ پر اس دور کا ذکر ہے جب ان کا واسطہ اس اُمّت سے پیش آیا۔ اس لیے اس سورت کی ابتدا میں ''اِسراء'' کا ذکر کیا گیا جو مسجد حرام سے بیت المقدس تک کے خطے کی اس اُمّت کے حق دار ہونے کی ایک دلیل ہے۔ پھر بیت المقدس کو قبلہ بنا کر اسے مزید مؤکد بنا دیا گیا، اور اس حق میں جھگڑا کرنے والے بنی اسرائیل کا ذکر کیا گیا جس کی بنیاد ارضِ مقدسہ بننے والی تھی۔ جدید مفسرین میں علامہ متولی شعراوی رحمہ اللہ نے بھی اس کو ترجیح دی ہے کہ یہ فساد اس اُمّت کے دور میں رونما ہونے والے ہیں:

وهذه التفسيرات على أنَّ الفَسَادَينِ سَابِقَانِ للإسلامِ، والأولى أن نَقُولَ إنَّهُمَا بعدَ الإسلامِ، وسَوفَ نَجِدُ فِي هذا رَبطًا لقصة بني إسرائيل بسورة الإسراء. (تفسير الشعراوي، ص۵۸۳)

''یہ تمام تفسیرات اس پر مبنی ہیں کہ یہ دونوں فساد اسلام سے پہلے گزر چکے ہیں‘ لیکن بہتر یہ ہے کہ ہم یوں کہیں کہ یہ دونوں اسلام کے ظہور کے بعد ہیں۔ اس صورت میں ہمیں بنی اسرائیل کے قصے کا سورۃ الاسراء کے ساتھ ربط بھی سمجھ میں آجائے گا۔''

مصر سے تعلق رکھنے والے شیخ عبد المعز عبد الستار رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے تھی‘ جو مجلّہ ''الأزھر'' میں جمادی الآخرہ ۱۳۷۶ھ میں شائع ہو چکی ہے۔ نیز کئی دوسرے عرب محققین بھی اس تفسیر کے راجح ہونے کے قائل ہیں۔

سورۃ الاسراء کی ان آیات میں یہود کے ساتھ کیے گئے وعدوں کے متعلق چند باتیں قابلِ غور ہیں۔

پہلی مرتبہ کے فساد پر اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو یہودیوں پر مسلط کرنے کی دھمکی سنائی ہے‘ اُن کے بارے میں مذکور ہے کہ:

﴿فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ اُوۡلٰىهُمَا بَعَثۡنَا عَلَيۡكُمۡ عِبَادًا لَّنَاۤ اُولِىۡ بَاۡسٍ شَدِيۡدٍ فَجَاسُوۡا خِلٰلَ الدِّيَارِ‌ ؕ وَكَانَ وَعۡدًا مَّفۡعُوۡلًا ۝۵﴾ (الإسراء)

''چنانچہ جب ان دو واقعات میں سے پہلا واقعہ پیش آیا تو ہم نے تمہارے سروں پر اپنے ایسے بندے مسلط کر دیے جو سخت جنگجو تھے‘ اور وہ تمہارے شہروں میں گھس کر پھیل گئے۔ اور یہ ایک ایسا وعدہ تھا جسے پورا ہو کر رہنا تھا۔''

جن بندوں کو یہود پر مسلط کرنے کی دھمکی دی گئی اُن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے عِبَادًا لَّنَاۤ فرمایا یعنی ''ہمارے اپنے بندے''، اور ان کے لیے ''بعث'' کا صیغہ استعمال کیا گیا جو عموماً انبیاء علیہم السلام کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی یہ بندے مسلمان ہوں گے‘ اور ایک دینی جذبے سے یہاں آئیں گے۔ جس طرح سورت کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم ﷺ کے لیے عَبۡدِهٖ کہہ کر اعزاز وتکریم فرمائی‘ اسی طرح ان آیات میں بنی اسرائیل کے اوپر مسلط ہونے والے بندے بھی ''اللہ کے بندے'' یعنی نیک ہوں گے۔ بخت نصر سمیت ماقبل اسلام انہیں تہ تیغ کرنے والے سارے دشمن کافر تھے‘ کیونکہ اُس وقت دینِ حق کے حاملین صرف یہودی یا عیسائی تھے‘ البتہ یہ اپنے دین پر پوری طرح عمل پیرا نہیں تھے۔ شیخ متولی شعراوی رحمہ اللہ نے اس استدلال کا بھی جواب دیا ہے کہ ''عبد'' کا لفظ مومن و کافر دونوں پر بولا گیا ہے۔

پہلے دشمن کے بارے میں یوں فرمایا ہے کہ ''وہ تمہارے گھروں میں گھس کر پھیل

گئے‘‘ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دشمن یہودیوں کی آبادی میں گھس کر انہیں سزا دے گا جبکہ آبادی اور تعمیرات باقی رہنے دی جائیں گی۔ بخت نصر اور رومی بادشاہ ٹائٹس نے تو پورے شہر کو تاراج کر دیا تھا‘ اور یہاں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی‘ جس میں بیت المقدس کی پوری عمارت بھی منہدم ہوگئی تھی۔

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہود کو فرمایا:

﴿ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝۶﴾ (الاسراء)

’’پھر ہم نے تمہیں یہ موقع دیا کہ تم پلٹ کر اُن پر غالب آؤ‘ اور تمہارے مال و دولت اور اولاد میں اضافہ کیا‘ اور تمہاری نفری پہلے سے زیادہ بڑھا دی۔‘‘

یعنی جس دشمن نے تمہیں گھروں میں گھس کر مارا تھا انہی لوگوں پر ہم نے تمہیں غلبہ دیا‘ نیز تمہاری نفری بھی بڑھائی‘ اور بعد میں وہی دشمن دوبارہ طاقت وَر بن کر تمہارے چہروں کو سیاہ کر ڈالیں گے۔ بخت نصر کی غلامی میں ستر سال رہنے کے بعد ایرانی بادشاہ سائرس نے بابل پر حملہ کرتے ہوئے اسے فتح کیا اور یہودیوں کی حالت زار پر رحم کرتے ہوئے ان کو آزاد کر کے دوبارہ فلسطین میں بسا دیا۔ یہودیوں کو بخت نصر یا ایرانی بادشاہ یا ان کی نسل پر غلبہ نہیں ملا‘ نہ ہی ان کی نفری کبھی اتنی بڑھی تھی جتنی آج ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ دونوں مرتبہ کے فساد اور اس کے ساتھ بڑی برتری اور غلبہ اس اُمّت کے دور میں ہوگا۔

اس لیے راجح یہی ہے کہ یہودیوں کا پہلا فساد رسول اللہ ﷺ کے دور میں ہوا۔ یہودیوں نے مدینہ میں مسلمانوں اور اللہ کے آخری نبی ﷺ کے خلاف سازشیں کیں‘ مشرکینِ مکّہ سے خفیہ ساز باز کر کے اُن سے تعاون کیا‘ بلکہ رسول اللہ ﷺ کو شہید کرنے کی کوشش کی‘ جس کی وجہ سے یہود کو پہلے مدینہ سے نکالا گیا اور پھر خیبر سے بھی۔ اللہ کے رسول ﷺ اور ان کے صحابہ جو اللہ کے مقبول بندے تھے‘ جہاد کرتے ہوئے یہودیوں کی آبادی میں گھس گئے‘ بنو قریظہ کو قتل کر دیا‘ ان کے بچوں کو غلام بنایا گیا‘ اور بنو نضیر کو شام کی طرف جلاوطن کر دیا گیا۔

سورۃ الاسراء کی اس آیت میں مسجد کا ذکر بھی اسی وجہ سے نہیں ہے بلکہ صرف گھروں کا

تذکرہ ہے‘ کیونکہ یہ پہلے فساد کی سزا تھی‘ اور وعد المرۃ الأولیٰ ہے‘ جب اللہ نے ان پر اہلِ مدینہ کو بھیجا تھا جو سخت جنگجو تھے۔ اس کی پیشین گوئی اللہ تعالیٰ نے پہلے فرمادی تھی‘ جس پر دلیل لفظ ’’اِذَا‘‘ ہے‘ جو مستقبل کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ نیز لفظ ’’وعد‘‘ بھی مستقبل کے لیے استعمال ہوتا ہے نہ کہ ماضی کے لیے۔ مسجد میں پہلی بار کے دخول کا وعدہ بعد میں حضرت عمرؓ کے دور میں پورا ہو گیا۔

پہلے فساد اور اس کی سزا کے وعدے کے بعد یہودیوں کو زمین میں ایسی برتری مل گئی جس کا واضح منظر ہمارے سامنے ہے کہ بہت سے عالمی اداروں کے مالکان اور دنیا کی سیاست کو کنٹرول کرنے والی شخصیات یہودی یا صہیونی ہیں۔ عالمی معیشت‘ سیاست‘ میڈیا میں یہودی چھائے ہوئے ہیں۔ غزہ کی تازہ صورتِ حال بھی یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ عیسائی دنیا اور عالَمِ عرب بلکہ چند ایک استثنائی صورتوں کو چھوڑ کر عالَمِ اسلام کا برسرِ اقتدار طبقہ ان کی مٹھی میں ہے۔ اربوں مسلمانوں کی نظروں کے سامنے غزہ کو تباہ کیا جا رہا ہے جبکہ کوئی کچھ کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ یہودیوں کی تعداد دنیا بھر میں تقریباً ڈیڑھ کروڑ ہو چکی ہے جو ان کی تاریخ میں ایک ریکارڈ ہے۔ انہیں وعدے کی سرزمین میں قدم جمانے کا موقع بھی مل چکا ہے جہاں انہوں نے ریاست قائم کی ہے۔ شاید یہ اس آیت کا واضح مصداق ہے۔

﴿ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝﴾ (الإسراء)

’’پھر ہم نے تمہیں یہ موقع دیا کہ تم پلٹ کر اُن پر غالب آؤ‘ اور تمہارے مال و دولت اور اولاد میں اضافہ کیا‘ اور تمہاری نفری پہلے سے زیادہ بڑھا دی۔‘‘

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ۝﴾ (الإسراء)

’’چنانچہ جب دوسرے واقعے کی میعاد آئی (تو ہم نے دشمنوں کو تم پر مسلط کر دیا) تاکہ وہ تمہارے چہروں کو بگاڑ ڈالیں‘ اور تاکہ وہ مسجد میں اُسی طرح داخل ہوں جیسے پہلے لوگ داخل ہوئے تھے‘ اور جس جس چیز پر اُن کا زور چلے اُس کو تہس نہس کر کے رکھ دیں۔‘‘

دوسرے واقعے کو وَعْدُ الآخرۃ کہا گیا کہ جب اس کے پورا ہونے کا وقت آئے گا تو ایک بار

پھر کچھ لوگ آ کر یہود کو اُن کے کیے کی سزا دیں گے۔ وہ یہود کے چہروں کو بگاڑ دیں گے۔ یہ لوگ بھی اسی طرح مسجد میں داخل ہو جائیں گے جس طرح پہلے لوگ مسجد میں داخل ہوئے تھے۔ اِن لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے مستقل کوئی لفظ ذکر نہیں کیا ہے بلکہ ضمیر لانا کافی سمجھا' گویا اس مرتبہ کے لوگ بھی پہلی قسم کے ہوں گے یا ان جیسے لوگ ہوں گے۔ گویا دونوں مرتبہ یہود کے ساتھ لڑائی صرف ایک ہی اُمّت کی ہوگی اور وہ مسلم اُمّت ہوگی۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ مسجد اس اُمّت کے ساتھ مخصوص عبادت گاہ ہے' اور اس کا یہاں پر ذکر بھی یہ راجح قرار دیتا ہے کہ ان دونوں فسادوں کا وقت اس اُمّت کے دور میں ہوگا۔

اس فساد کی سزا یہودیوں کو بالکل آخری زمانے میں حضرت امام مہدی کے دور میں دی جائے گی' جب مسلمانوں کو مسجدِ اقصیٰ پر بالادستی حاصل ہو جائے گی اور القدس دارالخلافہ بن جائے گا۔ ثُمَّ کی دلالت بھی یہ بتلا رہی ہے کہ دوسری بار کا فساد کچھ وقفے کے بعد ہوگا۔ بالفور کے وعدے سے ان کے عالمگیر فساد فی الارض کی ابتدا ہوئی اور انتہا حضرت امام مہدی کے دور میں ہوگی۔ چنانچہ حضرت امام مہدی کے بارے میں واضح روایات موجود ہیں کہ آپ کا دارالخلافہ بیت المقدس ہوگا' اور یہ یہودیوں کو یہاں سے نکالے بغیر ممکن نہیں ہوگا۔ بیت المقدس کی پاک سرزمین ان سے پاک کردی جائے گی۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن حوالہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

((يَا ابنَ حَوَالَةَ! إِذَا رَأَيتَ الخِلَافَةَ قَدْ نَزَلَتِ الأَرْضَ المُقَدَّسَةَ فَقَدِ اقْتَرَبَتِ الزَّلَازِلُ وَ البَلَابِلُ والأُمُورُ العِظَامُ، والسَّاعَةُ يَومَئِذٍ أَقربُ إِلَى النَّاسِ مِنْ يَدِيْ هٰذِه مِنْ رَأسِكَ .))(أبو داود' كتاب الجهاد)

''اے ابن حوالہ! جب تم دیکھو کہ خلافت ارضِ مقدسہ (بیت المقدس) میں آ گئی ہے تو زلزلے' مصیبتیں اور عظیم الشان امور بہت قریب آ چکے ہوں گے' تب قیامت اس سے زیادہ قریب ہوگی جتنا میرا ہاتھ تمہارے سر کے قریب ہے۔''

روایات سے وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ آخر زمانے میں ایک بار پھر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہوگی اور ایسا حضرت امام مہدی کے ذریعے ہوگا۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

المَهدِيُّ مَولِدُه بِالمدينة مِنْ أَهلِ بيتِ النبيِّ ﷺ واسمُه اسمي،

وَمُهَاجَرُه بيتُ المَقدِس. (رواه نعيم بن حماد في كتاب الفتن)

’’امام مہدی کی ولادت مدینہ میں ہوگی‘ آپ نبی ﷺ کے اہلِ بیت میں سے ہوں گے‘ آپ کا نام میرے نام کی طرح ہوگا‘ اور آپ کی ہجرت کی جگہ بیت المقدس ہوگی۔‘‘

اس بارے میں چند باتیں قابلِ غور ہیں۔

مذکورہ بالا آیت کو اگر اسی سورت کی آیت ۱۰۳‘ ۱۰۴ کے ساتھ ملائیں تو اس کی تفسیر بہت واضح طور پر سمجھ میں آتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا ﴿۱۰۳﴾ وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ﴿۱۰۴﴾﴾ (الإسراء)

’’پھر فرعون نے یہ ارادہ کیا تھا کہ ان سب (بنو اسرائیل) کو اس سرزمین سے اکھاڑ پھینکے‘ لیکن ہم نے اُسے اور جتنے لوگ اُس کے ساتھ تھے‘ اُن سب کو غرق کر دیا۔ اور اس کے بعد بنو اسرائیل سے کہا کہ: تم زمین میں بسو‘ پھر جب آخری وعدہ پورا ہونے کا وقت آئے گا تو ہم تم سب کو جمع کر کے حاضر کر دیں گے۔‘‘

فرعون کی خواہش تھی کہ بنی اسرائیل کو مصر کی سرزمین سے نکال باہر کر دے تاکہ اُس کی ساری رکاوٹیں دور ہوں‘ لیکن اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کو پانی میں غرق کر دیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو نجات دی‘ بلکہ انہیں فرعون اور اس کی قوم کے چھوڑے ہوئے مال و دولت کا وارث بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے یوں فرمایا: ’’زمین میں رہو‘ البتہ جب آخری وعدے کا وقت آ جائے گا تو ہم تم سب کو اکٹھے کر کے لے آئیں گے۔‘‘

اِس آخری وعدے سے متعدد مفسرین نے آخرت کا وعدہ مراد لیا ہے‘ یعنی دنیا میں جتنا عرصہ رہو اس کے بعد آخرت میں اللہ تم سب کو زندہ کر کے لے آئے گا۔ لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا‘ وعدُ الاٰخرۃ سے مراد آخرت کا وعدہ نہیں بلکہ یہ حضرت امام مہدی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت پورا ہوگا‘ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دوسرے وعدے کو ’’آخری وعدہ‘‘ قرار دیا ہے‘ یعنی اُنہیں اس کے بعد کسی قسم کے فساد کا موقع نہیں ملے گا بلکہ یہی سزا دنیا میں اُن کا آخری انجام ہوگا۔ اگر اس کی بجائے ’’الاخیرۃ‘‘ کہا جاتا تو اُس میں یہ احتمال ممکن تھا کہ ایک بار پھر یہ کوئی فساد پھیلا دیتے۔

اس لیے بہت سے مفسرین نے اس وعدے سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول لیا ہے‘ جیسا کہ محی السنۃ علامہ ابو محمد الحسین بن مسعود البغوی (المتوفی ۵۱۶ھ) کی تفسیر بغوی میں اسی آیت کے ذیل میں درج ہے:

فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ یعني یوم القیامة جِئْنَا بِكُمْ لَفِيفًا ....
وقال الكلبي: فإذا جاء وعد الآخرة یعنی مجيئ عیسی من السماء جئنا بکم لفیفا أي النزاع من کل قوم‘ من هاهنا و من هاهنا لفوا جمیعا (تفسیر البغري)

’’جب آخرت یعنی قیامت کا وعدہ آئے گا تو ہم تم کو اکٹھا کر کے لائیں گے۔ کلبی کا قول ہے کہ: جب آخری وعدہ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان سے نزول ہوگا تو ہم تم کو اکٹھا کر کے لائیں گے‘ یعنی ہر قوم سے کھینچ کر لائیں گے‘ یہاں سے اور وہاں سے‘ سب کو اکٹھا کریں گے۔‘‘

بہت وضاحت کے ساتھ اس منظر کا تذکرہ ہے کہ یہودی دنیا کے مختلف خطوں سے کھنچے چلے آرہے ہیں اور وعدۂ آخر کا وقت پورا ہونے والا ہے۔

علامہ ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ کی تفسیر تاویلات اهلِ السُّنَّة میں بھی یہ قول ذکر کیا گیا ہے:

وقال بعضهم ﴿اسكنوا الأرضَ﴾ ليس في أرض دون أرض ولكن اسكنوا أي أرض شئتم مشارقها و مغاربها، آمنین لا خوف علیکم علی ما أرادوا أن یخرجوکم من مشارق الأرض ومغاربها بالقتل کقوله:﴿واورثنا القوم الذين كانوا....﴾وهو قول ابن عباس رضي الله عنهما‘ وعلى هذا قال في قوله ﴿فإذا جاء وعد الأخرة﴾ بعث عیسی بن مریم ﴿جئنا بكم لفيفا﴾ أي جميعا مجتمعين من مشارق الأرض و مغاربها على ما تفرقوا، وقال بعضهم ﴿فإذا جاء وعد الآخرة﴾ يعني حياة عيسى و نزوله من السماء ﴿جئنا بكم لفيفا﴾ أي جميعا بانتزاع من القرى هاهنا و هاهنا لفوا جميعا و هو مثل الأول. (تفسير الماتريدي)

’’بعض کا قول ہے کہ اسکنوا الارض کا معنی یہ نہیں ہے کہ ایک جگہ رہو دوسری جگہ نہ رہو‘ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین میں جہاں کہیں رہنا چاہو رہو‘ مشرق ہو یا مغرب۔ امن کے ساتھ کسی خوف کے بغیر‘ جبکہ اس سے پہلے یہ خوف لاحق تھا کہ فرعونی

تمہیں قتل کر کے مشرق و مغرب سے نکال رہے تھے۔ جیسا کہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے اس قوم کو (زمین کا) وارث بنایا جنہیں کمزور سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ اس قول کے مطابق انہوں نے فرمایا کہ وعد الآخرة سے مراد یہ ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دوبارہ بھیجنے کا وقت آئے گا' تو ہم تم سب کو مشرق و مغرب سے اکٹھا کریں گے' جیسا کہ تم اس سے پہلے منتشر تھے' اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ: جب آخری وعدہ آئے گا' اس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات اور آسمان سے نزول ہے' تو ہم تم سب کو اکٹھا کر کے لائیں گے' یعنی ادھر اُدھر کے سب علاقوں سے اکٹھا کریں گے۔ یہ قول بھی پہلے قول جیسا ہے۔''

علامہ ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب ماوردی رحمہ اللہ نے بھی اپنی تفسیر النکت والعیون میں یہ قول نقل کیا ہے:

﴿فإذا جاء وعد الآخرة﴾ فيه ثلاثة أقاويل: أحدها وعد الإقامة، و هي الكرة الآخرة، قاله مقاتل، الثاني: وعد الكرة الآخرة في تحويلهم إلى أرض الشام' الثالث: نزول عيسى عليه السلام من السماء، قاله قتادة. ﴿جئنا بكم لفيفا﴾، فيه تأويلان: أحدهما مختلطين لا تتعارفون، قاله رزين، الثاني: جئنا بكم جميعا من جهات شتى، قاله ابن عباس و قتادة، مأخوذ من لفيف الناس. (تفسير الماوردي ص ۲۷۸)

''جب آخری وعدے کا وقت آئے گا'' اس کی تفسیر میں تین قول ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ اس سے مراد لوگوں کو دوبارہ زندہ کرنا ہے' یہ قول مقاتل کا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وعدۂ آخرہ سے مراد ان یہودیوں کو شام کی جانب پھیرنا ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد آسمان سے نزولِ عیسیٰ علیہ السلام ہے' یہ قول قتادہ کا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کہ ''ہم تمہیں اکٹھا کر کے لائیں گے'' اس کی دو تفسیریں کی گئی ہیں: کہ تم ایسے خلط ملط ہو جاؤ گے کہ ایک دوسرے کو نہیں پہچانو گے' یہ قول رزین کا ہے۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ ہم تم سب کو مختلف اطراف سے لے کر آئیں گے' یہ قول ابن عباس رضی اللہ عنہ اور قتادہ رحمہ اللہ کا ہے۔''

اس سورت کے شروع میں بھی بنی اسرائیل کے ساتھ دو وعدے فرمائے گئے تھے۔ پہلے وعدے کو وَعْدُ اُولٰىهُمَا کہا گیا اور دوسرے کو وَعْدُ الْاٰخِرَةِ کہا گیا ہے' یعنی آخری وعدہ' اور یہاں بھی اُسے وَعْدُ الْاٰخِرَةِ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اصولِ تفسیر کے مشہور قاعدے القرآن یفسّر بعضُه بعضا (قرآن کی ایک آیت دوسری آیت کی تفسیر کرتی ہے) کے مطابق آخرِ سورت

اوّلِ سورت کی تائید کرتی ہے۔

سیاق وسباق کے مناسب بھی یہی معنیٰ ہے‘ کہ جب فرعون جیسے ظالم نے بنی اسرائیل پر قسم قسم کے مظالم کیے اور ان کا بالکلیہ خاتمہ کرنا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کے ساتھیوں کو غرق کر دیا۔ بنی اسرائیل کو نہ صرف اُن جگہوں کا وارث بنایا بلکہ اُنہیں پوری زمین میں بقا اور سکونت کا احسان یاد دلایا۔ آیت کے آخری حصے میں اسی بقا کی انتہا بتلائی گئی ہے‘ یوں سورت کی ابتدا سورت کی انتہا کے مناسب ہوگئی کہ یہ آخری وعدہ ہے۔ جس طرح یومِ آخرت کو آخرت اس لیے کہتے ہیں کہ وہ آخری دن ہے اُس کے بعد کوئی دوسرا دن نہیں‘ اسی طرح یہ وَعۡدُ الۡاٰخِرَۃِ اس لیے ہے کہ اس کے بعد تمام یہودیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

اس دوسرے وعدے کے لوگ بھی وہی ہوں گے جو پہلے وعدے کے تھے‘ یعنی مسلمان۔ البتہ اس مرتبہ یہودیوں کے چہرے سیاہ کر دیے جائیں گے‘ یعنی انتہائی ذلت ورسوائی کا عذاب دیا جائے گا‘ جس کا اثر ان کے چہروں پر ظاہر ہو جائے گا‘ اور اس مرتبہ بھی فاتح لوگ مسجد میں داخل ہو جائیں گے جس طرح پہلی مرتبہ داخل ہوئے تھے۔ پہلی مرتبہ مسلمان حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں بیت المقدس میں داخل ہو گئے تھے‘ اور دوسری بار حضرت امام مہدی کے زمانے میں داخل ہوں گے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں مسجدِ اقصیٰ عیسائی قبضے میں تھی‘ یہودیوں کے قبضے میں نہیں تھی۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ پہلے فساد کے وقت مسجد یہود کے قبضے میں ہو‘ کیونکہ مسجد کا ذکر آخری وعدے میں ہے ﴿كَمَا دَخَلُوۡهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ لیکن اس دوبارہ داخلے کو پہلے داخلے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ پہلے وعدے میں صرف گھروں میں داخل ہونے کی پیشین گوئی کی گئی ہے‘ اُس وقت اُن کے گھر مدینہ میں تھے‘ اور مسلمان اُن کے گھروں میں گھس گئے تھے۔ یہودیوں کے پہلے فساد کے بعد مسلمان مسجد اقصیٰ میں داخل ہوئے اور پُر امن انداز میں داخل ہوئے۔ یہودیوں کے ”آخری وعدے“ کے وقت بھی وہ اُسی فاتحانہ شان سے ایک بار پھر مسجد میں داخل ہوں گے۔ گویا مسجد میں پہلا داخلہ یہودیوں کے خلاف پہلی فتح اور پہلے وعدے سے الگ تھا۔ یہود کے ساتھ کیے گئے آخری وعدے کی بنیاد ہی ”مسجد“ ہوگی‘ کیونکہ اب کے بار یہودی قبلۂ اوّل پر غاصبانہ طور پر قابض ہو چکے ہیں۔ اس لیے پہلے وعدے میں اس کا ذکر نہیں ہے لیکن آخری وعدے میں ہے۔

اسلامی تاریخ کے اس پورے عرصے میں یہودی جس طرح بیت المقدس پر غاصبانہ طور پر قابض ہو چکے ہیں اور انہوں نے وہاں کے مسلمانوں کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے' اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان کا مقصد مسجد کو شہید کر کے اس کی جگہ ہیکل سلیمانی کے نام سے دجالی مرکز بنانا ہے۔ خدا کبھی یہ دن نہ دکھائے! اللہ تعالیٰ کے اس مقدس گھر سے ممانعت اور ویرانی کی کوشش ایسا فساد ہے جس پر اللہ انہیں ضرور سزا دے گا۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾﴾ (البقرۃ)

''اور اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ کی مسجدوں پر اس بات کی بندش لگا دے کہ ان میں اللہ کا نام لیا جائے اور ان کو ویران کرنے کی کوشش کرے۔ ایسے لوگوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان (مسجدوں) میں داخل ہوں مگر ڈرتے ہوئے۔ ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں رسوائی ہے' اور انہی کو آخرت میں زبردست عذاب ہوگا۔''

''تفسیر طبری'' میں ابن جریر طبریؒ نے سورۃ البقرۃ کی اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے:

أما خِزيُهم في الدنيا فإنّه إذا قامَ المهدِيُّ قتَلهُمْ وأَسَرَهُمْ وسَبَاهُمْ كَذٰلِكَ الخِزي.

''ان کی رسوائی دنیا میں اس وقت ہوگی جب امام مہدی کا ظہور ہوگا' تو وہ انہیں قتل کریں گے' قید کریں گے' اور غلام بنائیں گے' یہی ان کی رسوائی ہوگی۔''

مزید یہ خبر بھی دی کہ یہ لوگ اُس ترقی کو بھی زیر وزبر کر دیں گے جو یہودیوں نے حاصل کر رکھی تھی۔ اس سے اس جانب بھی اشارہ کر دیا گیا کہ دوسرے وعدے کا وقت وہی ہے جب یہودی انتہائی عروج حاصل کر لیں گے اور اللہ تعالیٰ کے موعودہ عُلو تک پہنچیں گے۔ موجودہ زمانہ اس کی تصدیق کرتا ہے' کہ یہودی کھلم کھلا اور در پردہ اپنے سازشی منصوبوں کے ذریعے دنیا پر چھائے ہوئے ہیں۔ اسرائیل کی صورت میں (اِس اُمّت کے دور میں) پہلی بار انہیں ایک ریاست مل چکی ہے' جسے آباد کر کے انہوں نے عروج اور ترقی حاصل کر رکھی ہے۔ یہ ساری برتری حضرت امام مہدی کی خلافت کے ذریعے ہی ختم ہوگی۔

اگر اس آیت (۱۰۴) میں وَعْدُ الْاٰخِرَةِ سے مراد یومِ قیامت لیں تو یہ اس آیت کے

خلاف ہے جس میں مذکور ہے کہ قیامت کے دن سارے انسان اکیلے ہی اپنے رب کی جانب آئیں گے‘ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ (الانعام: ۹۴)

’’تم ہمارے پاس اسی طرح تنِ تنہا آؤ گے جیسے ہم نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا۔‘‘

جبکہ سورۃ الاسراء کی مذکورہ آیت میں جمیعًا کا لفظ ہے جس کا معنیٰ علامہ ماتریدیؒ نے مجتمعین سے کیا ہے۔ اس کا واضح مصداق آخری زمانے میں یہود کا گروہ در گروہ فلسطین میں آنا ہے‘ جبکہ ان پر ایک طویل دور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ایسا گزر چکا تھا کہ یہ زمین میں بکھرے ہوئے تھے‘ اور ان کی کوئی ریاست نہیں تھی‘ جیسا کہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ﴾ (الأعراف: ۱۶۸)

’’اور ہم نے دنیا میں ان کو مختلف جماعتوں میں بانٹ دیا۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے لیے زمین کے کسی خطے کو خاص نہیں کیا تھا لہٰذا یہ پوری زمین میں در بدر پھرتے رہے تھے۔ اس کے بعد یہ فلسطین میں آنا شروع ہو گئے‘ اور اپنے لیے ’’ریاست‘‘ بنا کر قوت اور بلندی حاصل کی جس کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا۔

البتہ حضرت امام مہدی کے دورِ خلافت کے آخر میں جب دجال کا خروج ہوگا تو وہ پوری دنیا میں گھومے گا لیکن مکہ و مدینہ کے ساتھ بیت المقدس بھی اس کی دست برد سے محفوظ رہے گا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کے بارے میں فرمایا:

((مَا شُبِّهَ عَلَيكُمْ فَإِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ لَيسَ بِأَعوَرَ، يَخْرُجُ فَيَكُونُ فِي الأَرضِ أَرْبَعِينَ صَبَاحًا، يَرِدُ مِنْهَا كُلَّ مَنْهَلٍ إِلَّا الكَعبَةَ وَبَيتَ المَقدِسِ وَالمَدِينَةَ.)) (رواه الطبراني)

’’یہ تمہارے اوپر مشتبہ نہیں ہونا چاہیے‘ کیونکہ (یہ کانا ہے‘ اور) اللہ عزّ وجل یک چشم نہیں ہے۔ یہ جب خروج کرے گا تو زمین میں اس کی زندگی چالیس دن باقی رہی ہوگی‘ یہ ہر جگہ اترے گا‘ سوائے کعبہ‘ بیت المقدس اور مدینہ کے۔‘‘

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا وقت ہوگا تو دجال حضرت امام مہدی اور ان کے ساتھیوں کا بیت المقدس میں محاصرہ کیے ہوئے ہوگا۔ ایسے وقت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے نزول فرمائیں گے اور دجال کا خاتمہ کر کے تمام یہودیوں کو قتل کریں گے۔ یہی وہ وقت ہوگا جب یہودیوں کے فساد سے زمین پاک کر دی جائے گی۔ ❁❁❁

غزہ میں معرکۂ روح وبدن

ریان بن نعمان☆

یہ اُجڑا اُجڑا چمن کیسا ہے جو بہارِ نو کا منتظر ہے؟ یہ ویران ویران سی بستی کیسی ہے جو زبانِ حال سے اپنے مٹنے کی کہانی سنا رہی ہے؟ یہ کھنڈر نما شہر کیسا ہے جو ع ''کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی'' کے مصداق اپنی عظمتِ رفتہ کا پتا دے رہا ہے؟ یہ دھویں اور مٹی کا طوفان کیسا ہے جو ایک عظیم تباہی کا تتمہ لگ رہا ہے؟ یہ مرجھائے ہوئے پھول اور بے رونق کلیاں کیسی ہیں جو موسمِ خزاں کی شدّت کی نشان دہی کر رہی ہیں؟ یہ خاک وخون میں لتھڑے ہوئے ہزاروں وجودِ انسانی کس کے ہیں جن میں زندگی کے ہونے یا نہ ہونے میں احتمال ہے؟ یہ سینکڑوں کٹے پھٹے لاشے کس کے ہیں جن کے چہرے اپنی بے بسی اور اپنوں کی بے حسی کی تصویرِ مجسّم ہیں؟ یہ محفوظ پناہ گاہوں کے متلاشی کون ہیں جن کے ظاہر سے خوف وہراس مگر باطن سے عزم وجزم کی کیفیات نمایاں ہیں؟ یہ کیسے قلب وجگر رکھنے والے سپوت ہیں جو اپنوں کو دفنانے کے بعد دوسروں کے آنسو پوچھتے نظر آ رہے ہیں؟ صبر وشکر کے درجاتِ عالیہ پر فائز یہ کیسی مائیں ہیں جو کبھی اپنے جگر کے ٹکڑوں کو قربانی واستقامت کا درس دیتی دکھائی دے رہی ہیں تو کبھی بوقت شہادت کلمۂ طیبہ کی تلقین کرتی نظر آ رہی ہیں؟ یہ آزادی کے متوالے کون ہیں جو جذبہ وجنوں سے سرشار اور تن من دھن کی قربانی کے لیے تیار ہیں؟ یہ معصوم بچے اور بچیاں کون ہیں جن کی ڈبڈباتی آنکھیں ایک طرف تو وقت کے صلاح الدین ایوبیؒ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی کھوج میں ہیں تو دوسری طرف تباہی وبربادی‘ وحشت ودہشت سے پتھرائی ہوئی ہیں‘ جن کے کان یا تو اپنوں کی جدائی کی خبر سُن چکے ہیں یا بس............ سننے ہی والے ہیں؟

ہاں یہ اندوہ ناک نقشہ القدس کا ہے۔ وہی القدس جو برکتوں والی سرزمین ہے۔ وہی القدس جو ہزاروں انبیاء کا مسکن ومدفن اور ان کی روایتوں کا امین ہے۔ وہی القدس جو سفرِ

☆ طالب علم رجوع الی القرآن کورس (سالِ دوم) قرآن اکیڈمی‘ کراچی

معراج کا مبدأ بنا‘ توحید کا عظیم الشان مرکز بنا‘ بعد ازاں مسلمانوں کا حرمِ ثالث کہلایا‘ جس کی خاکِ قدم بوسیٔ سیّد المرسلین ﷺ کی سعادت حاصل کر چکی ہے‘ جہاں کے نباتات و جمادات منتقلیٔ تولیتِ اقصیٰ کے عینی شاہد ہیں۔ ہاں یہ وہی القدس ہے جو آج اپنے متولیوں کے لیے مقتل گاہ بنا دیا گیا ہے‘ اپنے محافظین کے لیے تنگ کر دیا گیا ہے‘ اپنے فدائین کے لیے جائے آزمائش بنا دیا گیا ہے۔

اسلام انسانی مساوات کا علم بردار ہے‘ جو معیارِ تکریم و شرف تقویٰ کو قرار دے کر معاشرے کو ایک صحت مند بنیاد پر پروان چڑھانا چاہتا ہے۔ معاشرے کی مجموعی اُٹھان افراد کی سیرت و کردار پر منحصر ہوا کرتی ہے۔ گویا معاشی و معاشرتی و سیاسی سطح پر ایک مضبوط‘ پاکیزہ اور پُرامن معاشرہ وہاں کے افراد کی سیرت و کردار کی بلندی کی دلیل اور عظمتِ اخلاق کی علامت ہوتا ہے۔ افراد کے خارج (عالمِ اکبر) میں قیامِ امن ممکن نہیں ہو سکتا جب تک دل کی دنیا (عالمِ اصغر) سے انتشار و بے چینی کو رفع نہ کیا جائے۔ اس انتشار و اِفسادِ قلب کے اختتام کی کوئی شکل بجز اس کے موجود نہیں کہ خالق و مخلوق سے متعلق نفسِ انسانی میں اٹھنے والے سوالات کے تسلی بخش جوابات فراہم کر دیے جائیں۔ اس فراہمیٔ جواب کی کوئی صورت اس کے علاوہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ‘ رسول اللہ ﷺ‘ اُخروی حیات اور دیگر امورِ غیبی پر ایمان و تیقن اور اعتماد و اسناد رکھا جائے۔ معلوم ہوا کہ معاشرے کے امن و استحکام کی حقیقی اور واحد اساس ایمان ہے جبکہ وہاں امن و سلامتی کی صورت حال بلاواسطہ متعلق ہے افراد کی ایمانی کیفیات سے‘ اعتقادات و ایقان سے‘ افکار و نظریات سے۔ فرقانِ حمید اسی نظریہ کو اجمالاً یوں بیان کرتا ہے:

﴿فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۱﴾ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾﴾ (الانعام)

’’پس دونوں فریقوں میں سے کون زیادہ بے خوفی و اطمینان کا مستحق ہے؟ بتاؤ اگر تم کچھ علم رکھتے ہو۔ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا‘ حقیقت میں تو امن انہی کے لیے ہے اور راہِ راست پر وہی ہیں۔‘‘

اگر کسی فرد کے نظریات کی بِنا ہی دہشت گردی پر ہو‘ افکار کی اُٹھان ہی بربریت پر ہو‘ دیگر نوعِ انسانی سے اسقاطِ حقِ انسانیت ہی اس کے اعتقادات کا جزوِ لاینفک ہو‘ اِفساد و تخریب ہی

اس کا نصب العین ہو' عبادتِ نفس و شیطان اور کینہ و بغض وحسد وعداوت کے ظلمات سے اس کے دل کی دنیا اندھیر ہو' تو کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ خارج میں فروغِ امن اور اشاعتِ سلامتی کا ذریعہ بنے گا! ذرا تصوّر تو کریں کہ اگر ایک پورا معاشرہ ہی درندے نما انسانوں پر مشتمل ہو اور ستم در ستم یہ کہ اقوامِ عالم کی باگ ڈور بھی انہی کے خون آشام ہاتھوں میں ہو تو زمین میں انتشار و اضطراب کی اور کیا توجیہہ پیش کی جائے گی! بازارِ کشت وخون کے گرم ہونے کو اور کس سبب کے ساتھ ملحق کیا جائے گا! بے رحمی اور ظلم وتشدّد کی انتہا کو آخر کس منبع سے متعلق کیا جائے گا!

ربِّ کائنات ہر دور میں ایسے سخت گیروں کو انسانیت کے امتحان کے لیے مسلّط کرتا رہا ہے۔ دورِ حاضر میں اس پوری تصویر کا کامل انطباق اگر کسی معاشرے پر ہو سکتا ہے تو وہ یہودی و صہیونی معاشرہ ہے۔ ان کے عقائد میں یہ بات بڑی نمایاں ہے کہ انسان کہلانے کے حق دار اور اس عنوان کے تحت ملنے والے حقوق ومراعات کے اصلاً مستحق تو صرف یہود ہیں جبکہ غیر یہود تو عوام کالانعام کے مانند ہیں کہ جیسے چاہیں ہم ان سے سلوک رَوا رکھیں۔ فلسطین میں بالعموم پون صدی سے اور بالخصوص گزشتہ ایام سے جاری صہیونی بربریت کے پیچھے اصلاً یہی نظریات کارفرما ہیں جو ان کی ظالمانہ وجابرانہ اور رحم کے ہر عنصر سے عاری ذہنیت کی عکاسی وترجمانی کر رہے ہیں۔ مذہبی اعتقادات ونظریات کے تضاد ہی نہیں تصادم کے علی الرغم عالمی طاقتوں خصوصاً عیسائی دنیا کی غیر مشروط پشت پناہی پنجۂ یہود کی مضبوط گرفت اور مکارانہ وشاطرانہ حربوں کی گہرائی کا پتا دے رہی ہے۔ انسانی حقوق' حتیٰ کہ حقوقِ حیوانات کے علم بردار یورپی ممالک القدس کی آہ و بکا' تڑپتے لاشوں' مچلتے زخمیوں' سسکتے بچوں' دہائیاں دیتی عورتوں' قربان ہوتی جوانیوں کو نظر انداز کر کے دھونس ودھمکی اور ناجائز طور سے وجود میں آنے والے غاصب وقابض وقاتل اسرائیل کی پیٹھ ٹھونکتے نظر آ رہے ہیں۔ جانوروں کے حقوق کی پامالی پر واویلا مچانے والوں کو فلسطین میں یہ انسانی المیہ جنم لیتا ہوا نظر نہیں آتا۔ حقوقِ نسواں کے محافظوں کو غزہ میں ظلم وستم کا نشانہ بنتی صنفِ نازک پریشان نہیں کرتی۔ بچوں کے حقوق کی ضامن بننے والی تنظیموں کو ننھی جانوں کے ضیاع پر مشتمل یہ ہوش رُبا اعداد نہیں ستاتے۔ العجب! ثم العجب! ثم العجب!

غیروں سے شکوہ کے بعد ذرا اپنوں کے احوال بھی ملاحظہ ہوں۔ گزشتہ صدی میں جب اغیار اپنے اقتدار کی بساط لپیٹ رہا تھا اور سلطنتِ اسلامیہ کی وحدت میں سرحدوں کی لکیریں کھینچ

کر اسے ممالک میں تقسیم کر رہا تھا تو جاتے جاتے اپنا فرسودہ نظام اور اس کے رکھوالے‘ جو مغربی فکر کے دل دادہ اور سامراجی حکومتوں کے پٹھو تھے‘ چھوڑ گیا۔ انہی پٹھوؤں کی معنوی اور نسلی اولادیں آج مسلم اُمّت پر مسلط ہیں کہ جن کو اپنے زیرِتسلّط زمین کے باسیوں سے ہی وفاداری نہیں‘ کجا یہ کہ کئی لکیریں پار کر کے ’’دوسروں‘‘ کی غم خواری کریں۔ جن کٹھ پتلیوں کی باگیں ہی کہیں اور سے ہلتی ہوں‘ جن کا قبلہ ہی کبھی ماسکو کبھی بیجنگ تو کبھی واشنگٹن ہو‘ جن کی افواج ہی طاغوتی قوتوں کی ذہنی و عملی غلام ہوں‘ جن کے فیصلے ہی ’’بیرونی آقاؤں‘‘ کی مداخلت بغیر ادھورے رہتے ہوں‘ جن کی پالیسیاں ہی خود مختار نہ ہوں‘ جن کی مراعات ہی کی کوئی انتہا نہ ہو‘ جن کے گہرے مفادات نظامِ باطل سے وابستہ ہوں‘ جن کے قلوب ہی حلاوتِ ایمانی اور دینی حمیت وغیرت سے یکسر خالی ہوں‘ جن کا گفتار وکردار ہی ؎ ’’وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود‘‘ کے مصداق اغیار سے مرعوبیت کا مظہر ہو‘ جن کے اذہان ہی فرنگی ساخت کے ہوں تو کوئی سلیم الفطرت اور ذی عقل وشعور انسان کیوں کر اِن سنگ دلوں سے مصیبت زدوں کی امداد اور مظلوموں کے لیے اقدام کی اُمید لگا کر اپنی توقعات کا خون کرے! البتہ مَعۡذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمۡ وَلَعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ کی اُمید کے ساتھ ان سے گزارشات‘ معروضات‘ التجائیں کرتے رہیں گے کہ یہی ہمارے بس میں بھی ہے اور ہماری ایمانی غیرت وحمیت کا تقاضا بھی۔ ؎

اِک طرزِ تغافل ہے سو وہ اُن کو مبارک
اِک عرضِ تمنّا ہے سو ہم کرتے رہیں گے!

پاکستان جو مرضِ اسرائیل کے علاج کے طور پر وجود میں آیا تھا‘ آج اپنے فلسطینی بھائیوں‘ بہنوں‘ بزرگوں کے زخموں پر مرہم رکھنے سے قاصر ہے۔ عربوں کی پُرتعیش زندگی نے انہیں کھوکھلا کر دیا ہے۔ غیر عرب کو بھی عملی ونظری سطح پر مادہ پرستی‘ الحاد‘ سیکولرازم وجدیدیت کے اندھیروں نے اپنی ظاہری چکاچوند میں گم ہو کر ایمانی رمق کو انتہائی مدھم کر دیا ہے کہ انہیں آج نہ جائے مقتل سے اٹھنے والی بوئے خونِ شہیداں سونگھائی دیتی ہے‘ نہ دہائیاں دیتی اور چیختی چلّاتی صدائے پریشاں کچھ ستاتی ہے۔ نہ بے گور وکفن لاشوں کی کثرت دل میں کچھ ہلچل مچاتی ہے‘ نہ علاج کی سہولیات سے محروم‘ بے یار و مددگار لوگوں کے زخم ان کی آنکھوں کی نمی میں کچھ اضافہ کرتے ہیں۔ اس کے علی الرغم عالَمِ اسلام میں حزب الشیطان کی کارروائیوں میں زبردست

اضافہ دیکھا جا رہا ہے جس کے نمونے کبھی کنسرٹس میں تھرکتے اجسام کی شکل میں سامنے آتے ہیں تو کبھی گیند بلے کے تماشوں میں دھڑکتے قلوب کی صورت میں عیاں ہوتے ہیں۔ کبھی تعلیمی اداروں سے آنے والی نازیبا ویڈیوز سے واضح ہوتے ہیں تو کبھی قضیۂ فلسطین سے اظہارِ بیزاری کے ذریعے آشکارا ہوتے ہیں۔ کبھی حماس کے ۷ اکتوبر کے حملے کو معصوم جانوں کے ضیاع اور خودکشی کے مترادف گردانے سے نظر آتے ہیں تو کبھی شقاوتِ قلبی کی انتہا پر پہنچتے ہوئے اسرائیل کی حمایت میں دلائل پیش کرنے سے ظاہر ہوتے ہیں۔ غرض معاشرے کے مختلف طبقات کی مختلف کیفیات ہیں۔ جہاں اِن رذیل کیفیات کے حامل، اسفل سافلین کے طبقے سے متعلق گروہِ انسانی اپنی مستیوں، راگ رنگینیوں میں مست ہے تو وہیں زندہ ضمیر رکھنے والے، اُمّت کا درد رکھنے والے، فلسطین کے مسلمانوں پر گزرنے والے ایک ایک کرب کو اپنے دل میں محسوس کرنے والے، رات کے پہروں میں بہتی آنکھوں اور کانپتے ہاتھوں کے ساتھ اپنے مظلوم بھائیوں کی مظلومیت کا شکوہ ربّ المستضعفین کی بارگاہ میں کرنے والے، سوزِ دل اور نفسِ گرم سے معمور بے باک تقاریر و تحاریر کے ذریعہ اُمّت کے اجتماعی ضمیر کو جھنجھوڑنے والے، فلسطینی علَم تھامے اسرائیل مخالف نعرے لگاتے، سڑکوں اور میدانوں کو پُر کرنے والے باغیرت، باہمت، پُرعزم اور غیور رجالِ کار کی بھی ایک کثیر تعداد منظرِ عام پر ہے۔ حیرت انگیز طور پر اسرائیل مخالف فلسطینیوں کے حق میں قول و فعل سے اظہارِ جذبات کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ان غیر مسلموں کی بھی ہے جن کی فطرت کسی درجہ ظلماتِ تعصب سے سلامت ہے۔ یہ صورتِ حال نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے لیے ایک لمحۂ فکریہ اور گریبان میں جھانکنے کی داعی ہے بلکہ جسدِ غیرتِ ملّی کے رخسار پر ایک زناٹے دار طمانچہ بھی ہے۔

دربارِ نبوی ﷺ سے اُمّتِ مُسلمہ کو ایک جسدِ واحد قرار دیا گیا ہے کہ اگر آنکھ دُکھے تو سارا جسم اس کی تکلیف محسوس کرے مگر کیا کیجیے اُس شل اور بے حس وجود کا کہ جس کو اپنے ایک جزو کے کٹنے کا احساس ہی نہیں ہو پا رہا ہو۔ ملّتِ اسلامیہ کو ایک عمارت کی اینٹوں سے تشبیہ دی گئی ہے کہ وہ باہم مربوط و مضبوط ہوتی ہیں مگر کیا کیجیے اس کھوکھلی عمارت کی اینٹوں کا کہ جن کا ایک دوسرے کے لیے ذریعۂ تقویت بننا تو درکنار اپنے قیامِ وجود ہی کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ ایک حساس دل رکھنے والے، تمنائے شہادت رکھنے والے، جذبۂ قربانی رکھنے والے، سوزِ جگر

رکھنے والے مسلمان کے لیے کیا اعصاب شکن مقامِ آزمائش ہے‘ انتہائی بے بسی اور مجبورِ محض کی سی کیفیت ہے کہ وہ مالکِ کون ومکاں سے صرف دُعائیں ہی کر سکتا ہے‘ فقط مالی امداد ہی کر سکتا ہے اور بارگاہِ خداوندی میں اپنے عذرِ بے بسی کو وسیلۂ معذرت ہی بنا سکتا ہے‘ اس حال میں کہ یہ دعوتِ ربانی وشکوۂ مظلوماں اس کے دل کو چیر اور اس کے بدن کو جھنجھوڑ رہی ہوتی ہے:

﴿وَمَا لَكُمۡ لَا تُقَاتِلُوۡنَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَالۡمُسۡتَضۡعَفِيۡنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالۡوِلۡدَانِ الَّذِيۡنَ يَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اَخۡرِجۡنَا مِنۡ هٰذِهِ الۡقَرۡيَةِ الظَّالِمِ اَهۡلُهَا‌ ۚ وَاجۡعَلْ لَّنَا مِنۡ لَّدُنۡكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجۡعَلْ لَّنَا مِنۡ لَّدُنۡكَ نَصِيۡرًا ﴿٧٥﴾﴾ (النساء)

’’اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم قتال نہیں کرتے اللہ کی راہ میں اور ان بے بس مردوں‘ عورتوں اور بچوں کی خاطر جو مغلوب بنا دیے گئے ہیں‘ جو دُعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار‘ ہمیں نکال اِس بستی سے جس کے رہنے والے لوگ ظالم ہیں۔ اور ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی حمایتی بنا دے‘ اور ہمارے لیے خاص اپنے فضل سے کوئی مددگار بھیج دے۔‘‘

ایک بار پھر دنیا اور ہوس کے بزدل پجاریوں کا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نڈر غلاموں سے معرکہ چھڑا ہوا ہے۔ ایک طرف مادیت کی دبیز تہ میں لپٹے ہوئے کرائے کے سپاہی ہیں تو دوسری طرف سرتاپا روحانیت میں مستغرق اور توکّل علی اللہ کی معراج پر فائز مجاہدین فی سبیل اللہ ہیں۔ ان جواں مَردوں نے فضائے بدر تو پیدا کر دی ہے‘ کیا عجب کہ فرشتوں کا نزول بھی ہو رہا ہو۔ اس کیفیت کی بہترین عکاسی ’’قافلۂ ملّی کے حُدی خواں‘‘ کے ان اشعار میں ملتی ہے: ؎

دنیا کو ہے پھر معرکۂ رُوح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درِندوں کو اُبھارا
اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسا
اِبلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا
تقدیرِ اُمَم کیا ہے‘ کوئی کہہ نہیں سکتا
مؤمن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا!

علامہ اقبال مزید کہتے ہیں: ؎

کیا نہیں اور غزنوی کارگہِ حیات میں
بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہلِ حرم کے سومنات
قافلۂ حجاز میں ایک حُسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ وفرات

ربّ ذوالجلال کے حضور دست بستہ یہ التجا ہے کہ اُمّتِ مُسلمہ کے احوالِ دُنیوی واُخروی کو درست فرما دے۔ ان پر ہونے والے ظلم وستم کو امن وسکون وعافیتِ کاملہ سے بدل دے! مسجد

اقصیٰ اور اس کے محافظوں کی حفاظت کا انتظام فرمادے۔ ان کے زخمیوں کو شفائے کاملہ عاجلہ دائمہ مستمرہ اور شہیدوں کو جنّت الفردوس میں درجۂ عالیہ عطا فرمادے۔ روزِ قیامت اپنے حبیب ﷺ اور اپنے اِن محبوبوں کے رُو برو رسوائی سے ہماری حفاظت فرمادے! اے ارحم الراحمین! اے اکرم الاکرمین! اے وہ کہ انتظام و انصرامِ ارض وسماء جس کے قبضۂ قدرت میں ہے! کائنات کا ذرہ ذرہ اپنی حرکت میں جس کے اِذن کا محتاج ہے! واقعات جس کے کلمۂ کُن سے جنم لیتے ہیں' قلوب العباد جس کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں! اے خدائے بزرگ و برتر! تیری زمین فساد سے پُر ہو چکی اور مفسدین ہر قانونِ دنیوی سے بالاتر دندناتے پھر رہے ہیں۔ اے اِلٰہ العالمین! ہم اعتراف کرتے ہیں اپنی کمزوری کا' وسائل کی دستیابی کے باوجود ان کے صحیح استعمال پر عدمِ قدرت کا۔ اے اللہ! تو کمزوروں کا ربّ ہے اور تو ہمارا بھی ربّ ہے! اے رَبُّ المستضعفین! اپنے ان مظلوم بندوں کو اپنے چہرے کے نور کی پناہ عنایت فرما کہ جس سے تاریکیاں روشن ہو گئیں اور جس پر دنیا و آخرت کے معاملات درست ہوئے کہ تو ان پر یا ہم پر اپنا غضب نازل کرے یا تیرا اعتاب ان پر یا ہم پر وارد ہو۔ تیری ہی رضا مطلوب ہے یہاں تک کہ تو خوش ہو جائے اور تیرے بغیر کوئی زور اور طاقت نہیں۔ ولَاحول ولَا قوّۃ اِلَّا بِاللّٰہ!

فلسطین میں جنم لیے ہوئے اس انسانی المیے اور اقوامِ عالَم کی افسوس ناک صورتِ حال کے پس منظر میں ڈاکٹر ظفر کمالی نے بصورتِ نظم کیا خوب منظر کشی کی ہے۔ طویل نظم میں سے منتخب اشعار پیشِ خدمت ہیں: ؎

خاموش ہیں وہ دیکھ کے ہر ظلم و ستم کو — سب بھول گئے اپنے کیے قول و قسم کو
محسوس کریں کیسے ترے درد و الم کو — فرصت ہی نکاحوں سے نہیں شیخِ حرم کو
بگڑے ہوئے گھوڑے پہ کسے کیسے کوئی زین
اے ارضِ فلسطین' مری ارضِ فلسطین!

پامال ہوئے تیرے لیے سارے قوانین — ٹھوکر میں یو این او کی ہیں شاہوں کے فرامین
عادل ہی عدالت کی یہاں کرتے ہیں توہین — چنگیز و ہلاکو کو بھی ہے قبروں میں تسکین
تاریخ کے اوراق لہو سے ترے رنگین
اے ارضِ فلسطین' مری ارضِ فلسطین!

کہنے کو بہت ہیں ترے زردار مسیحا ہیں باعثِ افزونیٔ آزار مسیحا
گفتار کے غازی ہیں یہ لاچار مسیحا ہوتے ہیں کہیں ایسے بھی بیمار مسیحا!

حاجت ہے دواؤں کی تو وہ پڑھتے ہیں یٰسین
اے ارضِ فلسطین، مری ارضِ فلسطین!

ہے پیشِ نظر سب کے قیامت کا یہ کہرام خاموش ہے مجرم کی طرح مجلسِ اقوام
امداد ہو ظالم کی، ملے اُس کو ہی انعام کس درد کی آخر ہیں دوا تیرے چچا سام

ہم لوگ فرشتے ہیں یہ کہتے ہیں شیاطین
اے ارضِ فلسطین، مری ارضِ فلسطین!

موسم ہو کوئی، گرتے رہے ظلم کے اولے ٹھنڈے نہ ہوئے آج بھی بارود کے گولے
دیکھے گا یہاں کون ترے دل کے پھپھولے کیا وقت کی گردش ہے کہ ہٹلر کے ممولے

انساں کا لہو پی کے بنے بیٹھے ہیں شاہین
اے ارضِ فلسطین، مری ارضِ فلسطین!

ہوتا ہی نہیں ختم یہ کھیل اب بھی ہے جاری دِن رات تماشا ہی دکھاتے ہیں مداری
دولت کے پجاری ہیں یہ دولت کے پجاری جال اپنا بچھائے ہوئے بیٹھے ہیں شکاری

بجتی ہے سیاست کے سپیروں کی بہت بین
اے ارضِ فلسطین، مری ارضِ فلسطین!

بھرتے ہیں دکھاوے کے لیے جتنے یہاں آہ انجم ہے کوئی ان میں کوئی مہر کوئی ماہ
اے کاش کہ ہوتے وہ ترے سچے بہی خواہ سب تجھ کو سیاست کی سمجھتے ہیں چراگاہ

کیوں فکر انہیں ہو کہ یہ حالات ہیں سنگین
اے ارضِ فلسطین، مری ارضِ فلسطین!

سینہ جو ترے سامنے وہ تان رہے ہیں یہ کھیل ہے کس کا یہ سبھی جان رہے ہیں
منہ سے نہ کہیں دل سے مگر مان رہے ہیں پردے میں چھپے شخص کو پہچان رہے ہیں

اک روز یہ بدلے گی فضا بدلے گا یہ سین
اے ارضِ فلسطین، مری ارضِ فلسطین!

نالۂ فلسطین

ڈاکٹر ربیعہ ابرار☆

حالیہ اسرائیلی جارحیت میں شہید ہونے والے فلسطینیوں کو شمار کرنے کے لیے جب کوئی عدد درج کیا جاتا ہے تو اسے قلم بند کرنے سے قبل ہی کئی اور لاشیں گر چکی ہوتی ہیں۔ ۷ اکتوبر ۲۰۲۳ء سے تادمِ تحریر ۳۵ ہزار سے زائد فلسطینی محض غزہ میں شہید کیے جا چکے ہیں جن میں تقریباً ۱۵ ہزار بچے اور ۱۱ ہزار خواتین شامل ہیں۔ اسپتال زخمیوں کے لیے کم پڑ رہے ہیں اور قبریں شہداء کے لیے۔ اجتماعی قبروں میں بے نام لاشے اتارے جا رہے ہیں۔ کئی ایسے کفن ہیں جن میں مختلف لوگوں کے اعضاء اکٹھے دفنائے جا رہے ہیں۔ گویا زندہ رہنے کو جن کے پاس زمین نہ تھی، دفن ہونے کو الگ قبر بھی نہیں۔ جسم ایسے سلامت نہ رہے کہ ان کو کفن ہی انفرادی مل جاتا! جو زندہ ہیں وہ اس سے بدتر حال میں ہیں۔

اسرائیل اعلانیہ طور پر بجلی، پانی، کھانے اور دیگر امداد کی فراہمی بند کر چکا ہے۔ ہم اپنے گھروں میں بیٹھے اس کرب کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے جس کو فلسطینی جواں مردی سے جھیل رہے ہیں۔ رات کی تاریکی میں آبادی کی طرف بڑھتے ہوئے اسرائیلی افواج کے ٹینک، فضائی حملے پہلے ہی کتنی عمارتوں کو ملبے کا ڈھیر بنا چکے ہیں۔ کوئی سمت بھی محفوظ نہیں۔ مائیں اپنے ہاتھوں سے اپنے بچوں کے جسموں پر ان کے نام لکھتی ہیں تاکہ جب ملبے کے ڈھیر تلے ان کے تباہ شدہ لاشے نکالے جائیں تو شناخت ممکن ہو سکے۔ وقت کے فرعون اپنی روایت کو برقرار رکھے بچوں کا قتل عام کر رہے ہیں۔ سات اکتوبر کے واقعات کو جواز بنا کر اسرائیل بے باکی سے عالمی قوانین کو توڑتے ہوئے اپنا بہیمانہ کھیل جاری رکھے ہوئے ہے اور پشت پناہ مغربی سیاست دان اسے اسرائیل کا دفاعی حق قرار دے رہے ہیں۔ اس ساری صورت حال میں ہمارا کیا کردار ہے؟ کیا ہم اس ظلم اور ستم کے بنیادی حقائق سے آشنا ہیں؟ کیا ہم فلسطین کی اس تاریخ سے واقف ہیں جو موجودہ

☆ای میل: rabiaabrar24@yahoo.com

صورت حال کا سبب ہے؟ اسرائیلی جارحیت اور فلسطینیوں کا استحصال چند ماہ پرانا نہیں بلکہ اس کی تقریباً ایک صدی پرانی تاریخ ہے‘ جس کا آغاز خلافتِ عثمانیہ کے خاتمہ سے ہوتا ہے۔

مختصر تاریخ

بنی اسرائیل جب چنی ہوئی اُمّت کے عہدے سے معزول ہوئے تو ذلت ورسوائی ان کا مقدر بنی۔ آج جہاں کسی یہودی کے لیے کوئی سخت بات کہہ دینا انتہائی معیوب سمجھا جاتا ہے وہیں اب سے چند دہائیوں پہلے تک یہود عموماً انتہائی رسوائی اور پستی کا شکار تھے۔ یورپ میں وہ دو ہزار سال تک مغلوب اور مقہور رہے ہیں۔ ایک عرصے تک نچلے درجے کے شہریوں کی طرح زندگی گزارتے اور برابر کے حقوق کے لیے لڑتے ہوئے کئی یہود مفکّر یہ ماننے لگے کہ اس قوم کے لیے باعزت زندگی گزارنے کا واحد ذریعہ ایک الگ ریاست کا قیام ہے۔ ساتھ ہی ارضِ مقدس میں لوٹنے اور ماضی کی اپنی تاب کو بحال کرنے کی خواہش بھی ان کے دلوں میں ایک عرصے سے موجود تھی۔ اس سوچ نے صہیونیت کو جنم دیا‘ گوکہ یہ تحریک کوئی خاص مقبول نہ ہوسکی۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ انہیں اپنا وطن اور گھر چھوڑ کر کسی دوسری جگہ بسنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس تحریک کو ایک سیاسی اور عملی شکل دینے والا شخص تھیوڈور ہرزل تھا۔ اس نے ۱۸۹۶ء میں ’’Der Judenstaat‘‘ نامی ایک پمفلٹ چھاپا تھا‘ جس کا حاصل یہ تھا کہ یہود اقلیت کی صورت میں کبھی ترقی کی بلندی کو نہیں پہنچ سکتے اور فلسطین یا ارجنٹائن میں ایک یہودی ریاست کا قیام ضروری ہے۔ ان دونوں ممالک میں سے کسی ایک میں استعماری نظام کے ذریعہ قابض ہونا واحد حل ہے۔ اس کے اگلے ہی سال ۱۸۹۷ء میں سوئٹزرلینڈ میں ایک عالمی صہیونی کانفرنس منعقد کی گئی جس میں ہرزل کے منصوبے کے تحت ارضِ فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کو منظور کیا گیا۔ اس وقت فلسطین ایک عرب اکثریتی ملک تھا جس میں مسلمانوں کے ساتھ عیسائی (دس فی صد) اور یہود (پانچ فی صد) اقلیتیں پُرامن طریقے سے رہ رہی تھیں۔ فلسطین اگرچہ خلافتِ عثمانیہ کے زیر حکومت تھا‘ لیکن وہاں عرب قوم پرستی سر اٹھا رہی تھی۔ وہاں کے کئی باشندے آزاد ریاست کے حق میں تھے۔ برطانیہ صہیونیوں اور عربوں دونوں کے عزائم سے باخبر تھا‘ اس نے یہ موقع اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنا غنیمت جانا۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کے دوران برطانیہ کو اپنے حریف خلافت عثمانیہ کا سامنا تھا‘ لہٰذا ۱۹۱۵ء میں برطانوی نمائندے

نے قاہرہ میں عرب نمائندوں سے ملاقات کر کے انہیں عربوں کی آزادی کا یقین دلایا بہ شرطے کہ وہ برطانوی حکومت کے ساتھ مل کر ترکوں سے لڑیں۔ ۱۹۱۷ء میں برطانیہ کے خارجہ سیکرٹری نے معروف یہود خاندان روتھس چائلڈ کے ایک فرد والٹر روتھس چائلڈ کو خط لکھا جس میں فلسطین میں یہود کے لیے ایک وطن کے قیام کی حمایت کی گئی تھی۔ اسے ''بالفور ڈیکلریشن'' کہا جاتا ہے اور موجودہ فساد کی جڑ یہی خط ہے۔

۱۹۱۸ء میں خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے ساتھ فلسطین پر ترکوں کا چار سو سالہ دورِ حکومت بھی ختم ہو گیا۔ ہزاروں کی تعداد میں یہودی مہاجرین تمام یورپ سے فلسطین لائے جا رہے تھے۔ وہاں وہ زمینیں خریدنے‘ گھر بنانے‘ تعلیمی ادارے قائم کرنے کے لیے آزاد تھے‘ یہاں تک کہ انہوں نے ہاگاناہ (Haganah) نامی اپنی فوج تک منظم کر لی تھی۔ دوسری طرف فلسطین کے رہائشی عربوں سے کسی بھی معاملے میں ان کی مرضی معلوم کرنا گوارا نہ کیا گیا۔

یہود کی تیزی سے بڑھتی تعداد دیکھ کر عربوں کو یقین ہو گیا کہ ان سے کیا گیا آزادی کا وعدہ جھوٹا تھا‘ لہٰذا ۱۹۲۹ء میں انہوں نے بغاوت کا آغاز کیا۔ یہود کی تعداد دوگنی ہو گئی تھی‘ یعنی دس فیصد۔ ۱۹۳۶ء میں دوبارہ فسادات ہوئے۔ اس بار برطانوی افواج نے شدید ردِعمل دیا اور دو سے پانچ ہزار کے درمیان عرب مارے گئے۔ برطانیہ کوئی حتمی فیصلہ کرنا چاہتا تھا‘ وہ یہ کہ فلسطین کے دو حصے کر دیے جائیں: ایک یہود کے لیے‘ ایک عرب کے لیے۔ عرب سربراہوں نے اسے مسترد کر دیا کیونکہ وہ پورے فلسطین کے حق دار تھے۔ نتیجتاً فسادات میں شدت آئی اور وہ طویل ہوتے ہوئے ۱۹۳۹ء تک چلتے رہے۔ اب تک عربوں کی ایک بڑی تعداد یعنی کل بالغ مردوں کی دس فیصد آبادی قتل یا جلاوطن کر دی گئی تھی۔ پھر اس مسئلے کا ایک متبادل حل سوچا گیا۔ برطانوی حکومت نے ۱۹۳۹ء میں وائٹ پیپر جاری کیا جس میں زمین کے بٹوارے کو رد کیا گیا اور اس کے بدل میں دس سال کے بعد فلسطین کو آزاد کا فیصلہ کیا گیا۔ اس میں فلسطین میں یہود کی مزید نقل مکانی اور زمین خریدنے پر بھی چند پابندیاں عائد کی گئی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی بار صہیونیوں اور برطانوی حکومت میں اختلافات پیدا ہوئے۔ اس کا اظہار انہوں نے فلسطینیوں پر بم حملے کر کے کیا‘ جس میں درجنوں فلسطینی شہید ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں دوسری جنگِ عظیم نے اس معاملے کو مزید سنگین رخ دیا۔ نازیوں کے ہاتھوں یہود کے قتل عام نے ایک بڑی تعداد میں انہیں فلسطین

کا رخ کرنے کا جواز دیا۔ برطانیہ کی پابندی کے باوجود سینکڑوں یہود فلسطین میں سکونت اختیار کر رہے تھے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ عسکری اعتبار سے وہ فلسطین پر غالب ہیں۔ دوسری جنگ عظیم نے برطانیہ کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے لہٰذا اب وہ من مانی کرنے کے لیے آزاد ہیں۔ اور ہوا بھی یہی کہ ۱۹۴۷ء میں' تیس سالہ قبضے کے بعد برطانیہ فلسطین میں پھیلائے ہوئے اپنے فتنے سے برطرف ہوگیا اور معاملہ نئی تشکیل شدہ ''اقوام متحدہ'' کے سپرد کر دیا۔

صورت حال یہ تھی کہ بین گوریان (Ben Guiron) نامی صہیونی رہنما کی سربراہی میں فلسطینی یہود اب ایک منظم گروہ تھے۔ ان کی اپنی فوج تھی جو جدید ہتھیاروں سے لیس اور تجربہ کار فوجیوں پر مشتمل تھی۔ ان کی تعداد بھی اب تیس فیصد ہو چکی تھی اور وہ فلسطین کا چھ فیصد حصّہ خرید چکے تھے۔ نومبر ۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ نے فلسطین کے بٹوارے کا فیصلہ دیا اور فلسطینیوں کی اکثریت ہونے کے باوجود پچپن فیصد زمین اسرائیل کے لیے نامزد کر دی۔ فلسطینیوں بلکہ تمام عرب دنیا نے اس کی مخالفت کی۔ اقوام متحدہ کے اس فیصلے کو بظاہر تسلیم کر رہے یہود نے پس پردہ ایک دوسری ہی سازش تیار کر رکھی تھی۔ اپنی فوجی طاقت کے بل بوتے پر انہوں نے اقوام متحدہ کی نامزد کردہ زمین سے بھی زیادہ حصے پر قبضہ کر لیا۔ بے رحمی سے فلسطینیوں کو قتل کرتے یا ان کو زمین چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیتے۔ جب کسی علاقے کو خالی کروا لیتے تو اس کی تمام عمارتیں زمین بوس کر دیتے تاکہ اصل مالکان وہاں کبھی لوٹ کر اپنی ملکیت کا دعویٰ نہ کر سکیں۔

اس سلسلے کا ایک اہم واقعہ گاؤں دیر یاسین کا ہے۔ ۱۹ اپریل ۱۹۴۸ء کو صہیونی فوج نے اس گاؤں پر حملہ کیا۔ اقوام متحدہ کی انکوائری رپورٹ کے مطابق یہ حملہ نہایت وحشیانہ تھا۔ تقریباً ۲۵۰ افراد قتل کیے گئے' عورتوں اور بچوں کو بے لباس کر کے ان کی تصاویر لی گئیں اور پھر انہیں قطار میں کھڑا کر کے خودکار پستولوں سے ان پر فائر کھول دیے گئے۔ جنہیں قیدی بنایا گیا' ان کے ساتھ بھی غیر انسانی سلوک کیا گیا۔ اس واقعے نے خوف کی ایسی لہر پھیلائی کہ لوگ اپنے علاقے خالی کرتے گئے۔ اس طرح کے اور واقعات بھی رونما ہوئے اور فلسطین عربوں سے خالی ہوتا چلا گیا' یہاں تک کہ ۱۹۴۸ء کے آخر تک ڈھائی لاکھ فلسطینی ہجرت کر چکے تھے۔

۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو اسرائیل نے ایک آزاد ریاست کا اعلان کر دیا۔ امریکی صدر ہیری ٹرومین نے محض گیارہ منٹ میں اسرائیل کو تسلیم بھی کر لیا' حالانکہ اس کی بنیاد ہزاروں لوگوں کی

موت اور لاکھوں کی دربدری پر قائم ہوئی تھی۔

اطراف کے عرب ممالک نے مدد کے لیے حملہ تو کیا لیکن نہ وہ منظم تھے نہ ہی متحد۔ مزید یہ کہ ان کے پاس جدید اسلحہ بھی نہ تھا۔ نتیجہ شکست فاش رہا۔ مزید فلسطینی علاقے‘ جیسے رملہ اور لِدّہ‘ بھی اسرائیلی قبضے میں چلے گئے۔ پچاس ہزار فلسطینی ہجرت پر مجبور ہوئے‘ جن میں سے بیشتر پیدل تھے۔ اسے ’’لِدّہ ڈیتھ مارچ‘‘ کہا جاتا ہے۔ ۷۸ فیصد فلسطینی علاقہ اسرائیل بن چکا تھا۔ تین چوتھائی لوگ مہاجر بن چکے تھے۔ اس واقعے کو ’’نکبہ‘‘ یعنی آفت کہا جاتا ہے۔ ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے غزہ اور دریائے اردن کے مغربی کنارے پر بھی قبضہ کرلیا۔ وہاں رہ رہے لاکھوں لوگ اس کے زیر تسلط آ گئے۔

اسرائیلی تسلط میں فلسطینیوں کی زندگی

پچھلی کئی دہائیوں سے قید وستم کی زندگی گزارتے فلسطینی شہری حقوق سے محروم ہیں۔ اگر غزہ کی بات کی جائے تو خطہ ارض کی اس پٹی کو جو اسرائیل اور مصر کے درمیان واقع ہے‘ آج ’’زمین پر جہنم‘‘ کہا جارہا ہے۔ ایک سابقہ اسرائیلی افسر نے اسے قید خانے سے تعبیر کیا تھا۔ ۴۱ کلومیٹر طویل اور ۱۰ کلومیٹر چوڑی غزہ کی پٹی پر سات اکتوبر ۲۰۲۳ء سے قبل تقریباً ۲۲ لاکھ نفوس کی آبادی تھی‘ جن میں سے نصف بچوں پر مشتمل تھی۔ ۷۰ فیصد نوجوان طبقہ روزگار سے محروم اور ۹۰ فیصد کو پینے کا صاف پانی مہیا نہیں تھا۔ ۶۳ فیصد کو خوراک کی کمی کا سامنا اور ۵۹ فیصد غربت کی لکیر کے نیچے تھے۔

غزہ کے موجودہ حالات

حالیہ اسرائیلی جارحیت پچھلے ۱۴ برس میں اسرائیل کا پانچواں حملہ ہے۔ اس سے قبل ۲۰۰۹ء‘ ۲۰۱۲ء‘ ۲۰۱۹ء اور ۲۰۲۱ء میں اسرائیل ہزاروں فلسطینی جانیں لے چکا ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ غزہ میں رہنے والے اس حبس بے جا سے نکل بھی نہیں سکتے۔ ایک جانب سے سمندر‘ دو اطراف سے اسرائیل اور ایک طرف سے مصر سے ملحق چھوٹی سی زمینی پٹی میں محصور مکین ۲۰۰۷ء سے ناکابندی کا شکار ہیں۔ ایک طرف مصر نے اپنی سرحد یعنی رفح بند کر رکھی ہے۔ دوسری طرف غزہ میں آنے اور جانے والی ہر چیز پر اسرائیل کی کڑی نگرانی ہے۔ غزہ زمینی‘ فضائی اور بحری لحاظ سے اسرائیل کے تسلط میں ہے۔

غزہ میں رہنے والے لوگوں کے لیے زندگی اور موت دونوں ہی سفاک صورت حال اختیار کر گئے ہیں۔ کتنے ہی خاندان صفحہ ہستی سے مٹ چکے ہیں۔ بین الاقوامی فلاحی اداروں کے مطابق ہر روز غزہ میں اوسطاً دس بچوں کے ہاتھ یا پاؤں کاٹنے پڑتے ہیں۔ جسمانی زخم اور اذیتیں تو شاید وقت کے ساتھ ختم بھی ہو جائیں لیکن جو ذہنی اور جذباتی گھاؤ یہ بچے اپنی معصومیت کی عمر میں کھا رہے ہیں‘ اس کا مداوا کیسے ممکن ہو گا!

سات اکتوبر ۲۰۲۳ء سے قبل غزہ میں ۳۵ ا اسپتال تھے۔ اس وقت وہاں کے تمام ہی اسپتال تباہ ہو چکے ہیں یا تباہی کے دہانے پر کھڑے ہیں۔ بجلی‘ بنیادی سہولیات اور ادویات سے محروم صرف گیارہ اسپتال اپنی گنجائش سے کئی گنا زیادہ مریضوں کو سموئے ہوئے ہیں۔ ایک ایک بستر پر کئی مریض ہیں۔ راہ داریوں پر ہر جگہ زخمی لوگ موجود ہیں۔ پورا دن مسلسل کام کرتے ہوئے ڈاکٹرز اور رضا کار مریضوں کو بے ہوش کیے بغیر موبائل فون کی روشنی میں آپریشن کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ آپریشن معمولی نوعیت کے نہیں بلکہ اعضاء کو جسم سے الگ کرنے والے آپریشن ہیں۔ اسرائیل چن چن کر غزہ کے قابل اشخاص خصوصاً سرجنز اور ڈاکٹروں کو اٹھوا لیتا ہے۔ انہیں بدترین تضحیک‘ ذہنی اور جسمانی تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ کئی دنوں تک بے لباس رکھنا‘ بھوکا پیاسا رکھنا‘ واش روم کی سہولت کے بجائے ڈائپر استعمال کرنے پر مجبور کرنا‘ اتنی مار پیٹ کرنا کہ ہڈیاں ٹوٹ جائیں عام معمولات ہیں۔ یہ سب صرف اس لیے کہ غزہ کے لوگوں کی قوّتِ ارادی ہی مر جائے اور وہ پھر کبھی اس شہر کو دوبارہ آباد کرنے کے قابل نہ رہیں۔

چند ماہ میں ایک پوری آبادی ملبے کا ڈھیر بن گئی ہے۔ ڈیڑھ لاکھ سے زائد فلسطینی کسی محفوظ مقام کی تلاش میں غزہ کے ایک حصے سے دوسرے حصے کی جانب نقل مکانی پر مجبور ہیں‘ جس نے ان کے ذہنوں میں نکبہ کی یادیں تازہ کر دی ہیں۔ بے سروسامانی کے عالم میں اپنے گھروں کو چھوڑ کر نامعلوم منزل کی طرف پیدل چلتے یہ قافلے اپنے دائیں بائیں اسرائیلی بمباری کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ درحقیقت ان فلسطینیوں کے لیے کوئی بھی جگہ محفوظ نہیں۔ جن مقامات کو اسرائیل نے محفوظ قرار دیا تھا انہی پر زمینی اور فضائی حملے کئی لوگوں کی جان لے چکے ہیں۔ مدارس‘ عبادت خانے حتیٰ کہ ایمبولنس اور اسپتال تک محفوظ نہیں۔ سردی‘ غذا اور پانی کی قلت‘ کھلے آسمان تلے خیمے لگائے ٹھنڈے فرش پر سوتے‘ قضائے حاجت کے لیے چار سے پانچ گھنٹے کی قطار میں لگنے

جیسی مشکلات سے نبرد آزما غزہ کے لوگوں کے لیے امید کی کوئی کرن بھی روشن نہیں۔ بھوک کا یہ عالَم ہے کہ بچے گھاس اور جانوروں کا دانہ کھانے پر مجبور ہیں۔ سمندر کا پانی پینا اور نامناسب غذا کھانا مختلف بیماریوں کا سبب بن سکتا ہے۔ علاج کی سہولیات اور ادویات مفقود ہیں۔ گویا جو گولی سے یک دم نہیں مرے گا وہ بھوک سے آہستہ آہستہ مرجائے گا۔ مائیں عجیب آزمائش کا شکار ہیں۔ کسی کی اولاد ہڈیوں کے ڈھانچے میں تبدیل ہونے کے بعد بھوک سے مرگئی ہے‘ تو کسی نے جانوروں کے دانے سے پیس کر بنائی گئی روٹی کھلا کر اپنی اولاد گنوائی ہے۔ اسرائیلی فوج اخلاقی گراوٹ کی ہر حد کو پار کر چکی ہے۔ امداد وصول کرنے والے بھوکے لوگوں پر اندھا دھند فائرنگ کر کے سینکڑوں کو شہید کر دینا ان کے لیے کسی مذاق سے کم نہیں۔ خالی گھروں سے قیمتی اشیاء کی لوٹ مار کر کے سوشل میڈیا پر فخریہ ان کی ویڈیوز اَپ لوڈ کرنا‘ فلسطینیوں کی بے کسی اور ان کی موت کا مذاق بنانا معمولی اور روزمرہ کی بات ہے۔ اسرائیل اپنے ناپاک منصوبے کے تحت فلسطینی عربوں کی نسل کشی کر کے یہ علاقہ اپنے مکینوں کے لیے خالی کروا رہا ہے۔ غزہ میں موجود قدرتی گیس کا معاہدہ چھ ممالک کی کمپنیوں کے ساتھ پہلے ہی ہو چکا ہے۔ گریٹر اسرائیل کے اپنے خواب کو پورا کرنے میں اسرائیل پوری طرح سرگرم عمل ہے۔

مغربی کنارہ

غزہ اگر محض ایک زمینی ٹکڑا ہے تو مغربی کنارہ جس میں القدس کا علاقہ شامل ہے‘ اسرائیل کو اور بھی زیادہ شدّت سے مطلوب ہے۔ یہ نہ صرف قدرتی ذخائر سے مالا مال ہے بلکہ تاریخی اعتبار سے یہود‘ نصاریٰ اور مسلمانوں تینوں کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ دریائے اردن کے مغربی کنارے پر موجود فلسطینیوں کی اس آبادی پر اسرائیل ۱۹۶۷ء سے ظالمانہ طور پر قابض ہے۔ انبیاء کی سرزمین آج مسلمانوں پر تنگ ہے۔ بین الاقوامی قانون کے تحت ناجائز ہونے کے باوجود اسرائیل نے اپنے باشندے اِس فلسطینی زمین پر آباد کرنے شروع کر دیے تھے۔ اس وقت تقریباً سات لاکھ یہود فلسطینی مسلمانوں کی نجی زمینوں پر قابض ہیں۔ اسرائیلی فوج اور ان کے سینکڑوں ناکے فلسطینیوں کے روزمرہ امور اور آمد و رفت کو انتہائی مشکل بنائے ہوئے ہیں۔ یہاں ایسی سڑکیں اور جگہیں ہیں جہاں فلسطینیوں کا گزر ممنوع ہے۔ اپنی زمینوں اور کام کاروبار پر جانا حتیٰ کہ بچوں کا اپنی درس گاہوں تک پہنچنا ایک دشوار گزار عمل ہے۔ ماضی

میں ایسے واقعات بھی پیش آئے کہ ایک دس سالہ بچے پر اسرائیلی فوج نے اس لیے فائر کھول دیا کیونکہ وہ رک کر زمین پر سے اپنے گرے ہوئے چپس اٹھا رہا تھا۔ لوگ اپنے گھروں تک میں بھی سکون سے نہیں۔ رات کے کسی بھی پہر اسرائیلی فوج گھر میں گھس کر تلاشی لے سکتی ہے۔ یہ اس لیے تاکہ مسلمانوں کو یاد رہے کہ وہ یہاں محکوم ہیں۔

صرف فوج ہی نہیں، مغربی کنارے کے شہروں میں بسنے والے یہود بھی مسلمانوں پر ہر طرح کا ظلم وستم کرتے رہتے ہیں۔ ان کے علاقوں میں کچرا پھینکنا، ان کو مارنا پیٹنا، ان کی املاک کی توڑ پھوڑ اور آتش زدگی حتیٰ کہ تفریحاً ان کی جان لینا معمولات میں شامل ہے۔ مغربی کنارے پر بسنے والے فلسطینی ہر طرح کی ذہنی اور جسمانی اذیت کا شکار ہیں۔ یہ تمام مظالم اسرائیلی فوج کی سرپرستی میں ہوتے ہیں۔ اگر آپ مغربی کنارے میں بسنے والے فلسطینی ہیں اور آپ کا یہودی پڑوسی بے وجہ آپ کے گھر میں گھس کے توڑ پھوڑ کرتا ہے، آپ کے بچوں کو چھت سے لٹکا دیتا ہے، انہیں نیچے پھینکنے کی دھمکی دیتا ہے تو آپ بے بس ہیں۔ ایسے میں اگر آپ حکام کو شکایت کریں گے تو آپ ہی سے باز پرس ہوگی۔ سات اکتوبر کے بعد اسرائیل کے وزیر دفاع نے دس ہزار رائفلز وہاں مقیم یہودیوں میں بانٹی ہیں۔ یہ ایک واضح پیغام ہے کہ قابض اسرائیلی مسلمانوں کے ساتھ کس طرح کا سلوک کر سکتے ہیں۔

۲۰۲۳ء میں تقریباً ۵۰۰ فلسطینی مغربی کنارے میں شہید کیے گئے۔ ہزاروں قید میں ہیں۔ شہداء اور قیدیوں میں خاصی تعداد بچوں کی ہے۔ اسرائیل کا مقصد فلسطینیوں کی آنے والی نسلوں کو مٹانا اور ان کو دہشت زدہ رکھنا ہے۔ قید میں موجود فلسطینی بچوں اور عورتوں پر ہوئے تشدد اور مظالم کی داستان نہایت الم ناک ہے۔ بے جا مار پیٹ، بھوکا پیاسا رکھنا، بے لباس کرنا اور ذہنی، جسمانی، جنسی تشدد کا نشانہ بنانا عام ہے۔ اسرائیل دنیا کا واحد ملک ہے جہاں تین سال سے پندرہ سال تک کے بچوں، عورتوں اور بوڑھوں پر قائم بے بنیاد کیسز کی سماعت فوجی عدالتوں میں ہوتی ہے۔ بعض دفعہ بنا سماعت ہی کے قید سنا دی جاتی ہے۔ کئی بچے جو بے قصور قید کیے گئے، برسوں بعد جب رہا کیے گئے تو تشدد کے باعث اپنے حواس کھو چکے تھے۔ کئی علاقوں میں اسرائیلی حربے کامیاب بھی رہے۔ وہاں کے باشندے مجبور ہو کر اپنی زمین چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ البتہ بہت سے مسلمان اپنے پیاروں کو کھو کر اور ہر طرح کا ظلم وستم سہنے کے بعد بھی اپنے حقوق

کے لیے جواں مردی سے ڈٹے ہوئے ہیں۔ عالمی تجزیہ کار اس بات پر متفق ہیں کہ غزہ کی صورتِ حال مغربی کنارے کے فلسطینیوں کو بھی کسی نہ کسی صورت پیش آ کر رہنے والی ہے۔

دنیا کا ردِّعمل

غزہ اور بقیہ مقبوضہ فلسطین میں جاری مسلمانوں کا قتل عام جہاں عالمی ضمیر کو جھنجھوڑ رہا ہے وہیں چند لوگ ایسے بھی ہیں جو جھوٹے پروپیگنڈے کا شکار ہو کر اسرائیلی ہمدردی میں کھڑے ہیں۔ اسرائیل کا ساتھ دینے والوں کی اکثریت طاقت کے نشے میں چُور با اثر لوگ ہیں جن کا کوئی نہ کوئی مفاد فلسطینیوں کے خاتمے اور اسرائیل کی بقا سے جڑا ہے۔ امریکہ‘ برطانیہ جیسے ممالک میں جہاں عوام کی اکثریت مسلمانوں کے قتل عام پر سراپا احتجاج ہے‘ وہیں ان کی حکومتیں اسرائیل کے خلاف بولنے والوں کو مجرم قرار دے رہی ہیں۔ مسلمانوں کی نسل کشی پر آواز اٹھانے والوں کو یہود دشمن کہا جا رہا ہے۔

امریکہ کی پشت پناہی

حق دفاع کے نظریہ کی آڑ میں امریکہ روزِ اول سے اسرائیل کے جرائم کا پشت پناہ بنا ہوا ہے۔ بظاہر وہ دنیا بھر میں عورتوں اور بچوں کا ہمدرد بنتا ہے جبکہ غزہ میں معصوم جانوں کے قتل عام میں ہر طرح سے تعاون کر رہا ہے۔ پچھلے ۷۵ برسوں میں جب کبھی بھی اقوام متحدہ میں فلسطین کے مسئلے کو حل کرنے یا جنگ بندی کے سلسلے میں اسرائیل پر دباؤ ڈالنے کی بات ہوئی‘ امریکہ نے ہمیشہ ہی اس فیصلے کو ویٹو کر دیا۔ امریکہ ایک ایسی طاقت ہے جس کی چودھراہٹ عالمی عدم استحکام سے وابستہ ہے۔ دنیا میں جنگیں ہونا اس کے لیے معاشی طور پر فائدہ مند ہے۔ مختلف ممالک کا حالت جنگ میں ہو کر غیر مستحکم ہونا اس کے عالمی تسلط کو قائم رکھنے میں معاون ہے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر افغانستان‘ شام اور عراق جیسے ممالک سے قدرتی ذخائر کی چوری‘ اسلامی ممالک کو ایٹمی طاقت بننے سے روکنا‘ ان کو آپس میں لڑوا دینا یا پھر مختلف ممالک میں باغی تحریکوں کی مدد کر کے وہاں کی حکومتوں کو گرا دینا! امریکہ کے جرائم کی فہرست نہایت طویل ہے۔ مشرق وسطیٰ پر تو ہر عالمی طاقت کی ہمیشہ سے نظر رہی ہے کیونکہ یہ علاقہ تیل اور دوسرے قدرتی ذخائر سے مالا مال ہے۔ ساتھ ہی یہ یورپ اور ایشیا کے درمیان تجارت کا راستہ بھی ہے۔

امریکہ ساری دنیا میں امن اور اپنی اعلیٰ اقدار کا پرچار کرتا رہتا ہے لیکن دراصل سامراجی

ذہنیت کا مالک ہے۔ یہ اپنے قیام کے ۲۴۵ سال میں سے ۲۲۸ سال حالت جنگ میں رہا ہے۔ اپنے مفاد اور برتری کو قائم رکھنے کے لیے یہ کتنے ہی ممالک کے معاملات اور جنگوں میں مداخلت کرتا رہا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں اسرائیل امریکہ کا ایک آلہ کار ہے جس کے ذریعے سے بلاواسطہ وہ اس علاقے کو اپنے دباؤ میں رکھتا ہے۔ اس کی ایک مثال ۱۹۶۷ء کی چھ روزہ عرب اسرائیل جنگ ہے جب دو ایسی حکومتوں کا پاسا الٹا گیا تھا جو امریکہ کی مرضی کے خلاف جانا چاہتی تھیں، یعنی مصر اور شام۔ اگرچہ موقف یہ اپنایا گیا تھا کہ یہود کے خلاف عربوں کے حملے روکنے کے لیے جنگ کی گئی تھی لیکن درحقیقت معاملات کچھ اور تھے، یعنی عرب زمین پر قبضہ۔ Mattity Peled جو اس جنگ میں اسرائیلی کمانڈر تھا، اس نے اسرائیلی اخبار Haarettz کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا تھا کہ ''یہ نظریہ کہ عربوں کے ہاتھوں یہود کی نسل کشی سے بچنے اور اسرائیلی زمین کے دفاع کے لیے ۱۹۶۷ء کی جنگ لڑی گئی تھی، ایک فریب تھا جو کہ جنگ کے بعد گھڑا گیا تھا۔'' ۱۹۸۱ء میں اسرائیل نے امریکہ کی شہ پر اچانک فضائی حملہ کر کے عراق میں ایک زیر تعمیر جوہری ری ایکٹر Osivak کو تباہ کیا۔ اس وقت عراق ایران جنگ میں امریکہ بظاہر تو عراق کا حامی تھا لیکن درحقیقت وہ ان دونوں اسلامک ممالک کی تباہی کا خواہاں تھا۔ پھر ۱۹۸۲ء میں اسرائیل نے امریکہ کی امداد کے بل پر لبنان پر حملہ کر دیا تاکہ وہاں موجود فلسطینی مجاہدین کی سرکوبی کی جاسکے۔

مشرق وسطیٰ سے باہر بھی جب امریکہ جنوبی افریقہ میں نسلی عصبیت پر مبنی نظام کو اعلانیہ فروغ دینے سے قاصر تھا، اس کے لیے کارِ سیاہ اسرائیل ہی انجام دیتا رہا۔ چلی میں آمریت کی بقا کی کوشش، گوئٹے مالا میں مقامی لوگوں کی نسل کشی، یہ سبھی کام امریکہ کے لیے اسرائیل کرتا رہا۔ اس کے علاوہ ایران پر دباؤ بنائے رکھنے کے لیے بھی امریکہ اس کے بحری جہازوں پر حملے، اس کے جوہری ماہرین کو قتل اور جاسوسی کے کام اسرائیل کے ذریعے ہی کرواتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ شام اور لبنان کے علاقوں پر اسرائیل مستقل بم باری بھی کرتا رہتا ہے۔ انہی سب مقاصد کے لیے امریکہ ہر معاملے میں اسرائیل کا غیر مشروط حامی اور مددگار ہے۔ امریکی صدر جو بائیڈن نے ایک بار کہا تھا: ''اگر موجودہ اسرائیل نہ ہوتا تو امریکہ کو کوئی اسرائیل ایجاد کر کے اس کا دفاع کرنا ہوتا۔''

مسلمان ممالک کا کردار

جہاں اسرائیل کو دنیا بھر سے بڑی بڑی قوتوں کی غیر مشروط حمایت حاصل ہے وہاں

فلسطین پر پچھلی کئی دہائیوں سے جاری ظلم وستم کا تاحال کوئی مداوا نہیں۔ موجودہ صورتِ حال نے تو صاف عیاں کر دیا ہے کہ فلسطین کے لوگوں کا اللہ کے سوا کوئی آسرا نہیں۔ مسلمانوں میں سے جو طاقتور ہیں‘ ان کو فلسطین سے کوئی غرض نہیں۔ جو دنیاوی اعتبار سے کمزور ہیں‘ انہوں نے کسی قدر غیرتِ دینی کا ثبوت دیا ہے۔ یمن کی حوثی تحریک نے غزہ کے مسلمانوں کے ساتھ اظہارِ یکجہتی کے طور پر اسرائیل جانے والے بحری جہازوں پر جو حملے کیے‘ اس کے ردِّعمل کے طور پر امریکہ اور برطانیہ نے کینیڈا‘ آسٹریلیا‘ بحرین اور نیدرلینڈز کی حمایت کے ساتھ یمن کے ۶۰ سے زائد مقامات پر فضائی حملے کیے۔ یمن جو اس وقت دنیا کے مفلوک الحال ممالک میں سرفہرست ہے‘ اس پر دنیا کی دو طاقتور ترین ریاستوں کا حملہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اسرائیل کو امریکہ اور اتحادیوں کی مکمل سرپرستی حاصل ہے۔ سوال یہ ہے کہ مسلمان جن کا ایمان ہی اپنے مسلمان بھائی کی خیر خواہی کے بغیر مکمل نہیں‘ پچھلے ۷۶ سال میں اپنے فلسطینی بھائیوں کی تباہی پر خاموش کیوں ہیں؟ اگر وہ اپنے تئیں کوشش کر رہے ہیں تو انصاف کیوں نہیں ہو رہا؟

فرمانِ رسول اللہ ﷺ ہے: ’’قریب ہے کہ دیگر قومیں تم پر ایسے ہی ٹوٹ پڑیں جیسے کھانے والے پیالوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔‘‘ ایک کہنے والے نے کہا: کیا ہم اس وقت تعداد میں کم ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’نہیں‘ بلکہ تم اس وقت بہت ہو گے لیکن تم سیلاب کی جھاگ کے مانند ہو گے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمن کے سینوں سے تمہارا خوف نکال دے گا‘ اور تمہارے دلوں میں ’’وہن‘‘ ڈال دے گا۔‘‘ ایک کہنے والے نے کہا: اللہ کے رسول ﷺ! ’’وہن‘‘ کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’دنیا کی محبت اور موت کا ڈر۔‘‘ (سنن ابی داؤد: ۴۲۹۷)۔ آج کا ہمارا دور یہی ہے کہ دنیا کی محبت‘ حرص اور اقتدار کی چاہ مسلمانوں اور خصوصاً ان کے حکمرانوں میں ہمیشہ سے زیادہ ہے۔ ایک طرف غزہ کے مسلمان محاصرے اور قید کا شکار تھے تو دوسری طرف متحدہ عرب امارات اور بحرین تجارت اور مالی فوائد کے لیے اسرائیل سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ اسرائیل میں سیاحت کے فروغ کے لیے متحدہ عرب امارات میں بڑے بڑے بینرز سڑکوں پر آویزاں کیے جا رہے تھے۔

جنوبی افریقہ نے‘ جو خود سامراجی حکومت کے ظلم وستم کا شکار رہ چکا ہے‘ عالمی عدالت میں اسرائیل کے خلاف نسل کشی کا کیس دائر کر کے اپنے تئیں کچھ عملی اقدام تو کیا۔ یہ کیس تاریخ میں

اپنی نوعیت کا ایک منفرد کیس ہے۔ عدالتی کارروائی کے خاتمے کے اگلے روز ۴۵ ممالک میں فلسطین کی حمایت میں لوگوں کے ہجوم مظاہروں کے لیے گھروں سے نکلے جب کہ مصر‘ الجیریا اور سعودی عرب کے عوام کو ایسا کرنے کی اجازت نہ ملی۔ مصر کی سرحد غزہ سے لگتی ہے لیکن اس نے اسے سنگ دلی سے بند کر رکھا ہے۔ غزہ میں قحط سالی کا علم ہے‘ لیکن امداد ضرورت سے کئی گنا کم پہنچ رہی ہے۔ انتہائی ضروری علاج کے لیے جن مریضوں کو مصر منتقل کیا جانا ہوتا ہے انہیں اس قدر سکیورٹی مراحل کا سامنا ہوتا ہے کہ کئی راستے ہی میں دم توڑ جاتے ہیں۔ مصری حکومت کو اگر کسی چیز کی پروا ہے تو وہ یہ کہ ان کے اپنے تعلقات اسرائیل سے خراب نہ ہو جائیں۔

دنیا کی آبادی کا ۲۴ فیصد حصّہ ہو کر بھی مسلمان آج واقعتاً سمندر کا جھاگ ہو کر رہ گئے ہیں۔ آج ہم میں کوئی صلاح الدین ایوبی یا شاہ فیصل جیسا باحمیت حکمران موجود نہیں۔ اپنے مفاد کی بلند دیواروں کے پار اہلِ فلسطین کی آہوں اور مسجد اقصیٰ کی پکار کوئی نہیں سن پا رہا!

فلسطین اور ہمارا کردار

فلسطین کے ماضی اور حال کو جاننے کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک عام مسلمان شہری دعا کے علاوہ اور کیا کر سکتا ہے؟ سب سے پہلے تو یہ یاد رکھا جائے کہ اپنا حصّہ اور کردار ہر شخص نے ضرور ادا کرنا ہے۔ یہ معاملہ محض ہمدردی اور رحم دلی کا نہیں بلکہ ہمارے ایمان کی کسوٹی ہے۔ مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں کہ ایک حصے کی سوزش سارے بدن کو جگائے رکھتی ہے۔ اگر اہلِ غزہ کی پکار ہمیں رلا نہیں رہی ہے تو ہمیں چاہیے کہ اپنے ایمان کو ٹٹولیں۔ اہلِ فلسطین کے لیے اس وقت واحد ہتھیار اور امید کی آخری کرن وہ آواز ہے جو وہ سوشل میڈیا کے ذریعے سے لوگوں کو پہنچا رہے ہیں۔ مغربی میڈیا فلسطین کے بارے میں صرف جھوٹ کو فروخت دے رہا تھا لیکن اب موبائل اور انٹرنیٹ کے ذریعے سچ دنیا تک پہنچ رہا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اہلِ فلسطین کے مددگار بن جائیں۔ اسرائیل لاکھوں ڈالر خرچ کر کے اپنے جھوٹ کو مختلف پلیٹ فارمز پر نشر کر رہا ہے۔ ہم اتنا تو کر ہی سکتے ہیں کہ اہلِ غزہ کی زندگی کو جہنم بنانے والی کوششوں کو ناکام کریں۔

اس سلسلے میں ہر شخص کی کوشش اور کردار اہم ہے۔ ضروری ہے کہ مستند ذرائع سے اہلِ غزہ کے بارے میں خود کو باخبر رکھیں۔ ہمیں اپنے دل کو زندہ رکھنا ہے۔ اگر ہمارے لیے اس بربریت کی پوسٹس کو محض دیکھنا اور شیئر کرنا مشکل ہو رہا ہے تو جو لوگ دن رات ایسی زندگی جی

رہے ہیں وہ کس حال میں ہوں گے۔ جو لوگ سوشل میڈیا پر شیئر کر سکتے ہیں وہ وہاں پیغام آگے پہنچائیں۔ جو لکھ سکتے ہیں وہ لکھیں۔ جو بول سکتے ہیں وہ بولیں۔ اسرائیل کے پروپیگنڈے کو بھی بے نقاب کریں۔ وہ جو خود کو مشرقِ وسطیٰ کی واحد جمہوری حکومت بتاتے ہیں اور ہولوکاسٹ کی آڑ میں اہلِ غزہ کی نسل کشی کو اپنا دفاع بتاتے ہیں' ان کے جرائم کو اَن دیکھا اور اَن سنا نہ رہنے دیں۔

دوسرا عملی قدم ایسی مصنوعات کا بائیکاٹ ہے جن کی فروخت سے حاصل شدہ آمدنی اسرائیل کو اس کے جرم میں معاونت کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں درست اشیاء کا تعین ضروری ہے تاکہ خاطر خواہ نتائج برآمد ہوں۔ دنیا کے مختلف ممالک جن کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں' وہ بھی انسانیت کے ناطے اسرائیلی اور امریکی مصنوعات کا بائیکاٹ کر رہے ہیں جبکہ ہمارے یہاں کئی لوگ کھوکھلے بہانے تراش کر اسرائیلی مصنوعات اور برینڈز کو استعمال کر رہے ہیں۔ کیا ہم میں ذرا بھی کوئی دینی حمیت باقی نہیں رہی! اِدھر آپ برگر اور کولڈ ڈرنک کے ذائقے پر سمجھوتا نہیں کر سکتے' ادھر غزہ میں لاکھوں لوگ قحط سالی کے دہانے پر کھڑے ہیں۔ بائیکاٹ کا حصّہ ضرور بنیں۔ خود بھی رکیں اور دوسروں کو بھی روکیں۔ تیسری چیز مسلمانوں کا آپس میں اختلافات بھلا کر متحد ہونا ہے۔ آج مسلمان دوسرے مسلمان کا دشمن جبکہ کافر کا دوست بنا ہوا ہے۔ دنیا کی ۲۴ فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ اگر ہم متحد ہو جائیں تو دشمن کی کیا مجال ہو سکتی ہے کہ وہ آنکھ اٹھا کر بھی ہمیں دیکھے۔ ہماری جان اور حرمت کو پامال کرے! ہمارے مقدس مقامات کو روندے۔ یہ اتحاد قرآن اور سُنّت کی رسی کو مضبوط تھامنے ہی سے ممکن ہے۔

آخری اور انتہائی اہم چیز مسلمانوں کا ترقی کے میدان میں پیچھے رہ جانا ہے۔ ہمارے تابناک ماضی کی بنیاد علم سے مضبوط رشتے میں تھی۔ کوئی بھی میدان مسلمان سائنس دانوں اور محققین سے خالی نہ تھا۔ آج ہم ہر طرح کی ٹیکنالوجی کے لیے غیروں کے محتاج ہیں۔ علم و تحقیق کے میدان میں پیچھے رہ جانے کے سبب آج دنیا میں ہماری کوئی عزت ہے نہ وقعت۔ کیا ہم صرف اس امر کا انتظار کرتے رہیں گے کہ دنیا کا ضمیر جاگے۔ کوئی مقام اور حیثیت بنانے کے لیے ہمیں خود محنت کرنی ہوگی۔ یاد رکھیں ہماری عزت صرف اور صرف اسلام سے جڑی ہے۔ مسلمانوں کا اتحاد فہم دین سے وابستہ ہے۔ یہی ہمیں زوال کی کیفیت سے باہر نکالے گا!

اسلامی نظام بذریعہ انتخابات
مولانا مودودیؒ کے موقف میں تبدیلی
ایک مطالعاتی تجزیہ (۲)

سعادت محمود ☆

درج بالا اقتباسات کا دو پہلوؤں سے جائزہ لینا مقصود ہے۔

پہلا پہلو

دیے گئے اقتباسات سے چار نتائج اخذ کیے گئے ہیں جن کو نیچے دیا گیا ہے۔ اس سے اسلامی نظام کے قیام کے بارے میں ابتدائی موقف اور بعد کے موقف میں واضح تضاد نظر آ رہا ہے۔ یہی اصل نقطۂ انحراف ہے جو کہ رفتہ رفتہ جماعت اسلامی کو اس مقام پر لے آیا جس کا ذکر ابتدا میں کیا گیا ہے۔ باقی دو پہلوؤں سے جائزہ ان چار نکات کے موازنے کے بعد دیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ یہ تجزیہ صرف اسلامی نظام کے قیام کے طریقۂ کار میں تبدیلی کے بارے میں ہے۔ حقیقی نصب العین (رضائے الٰہی اور فلاحِ اُخروی کا حصول) پر علیحدہ سے لکھنے کا ارادہ ہے۔

نتیجہ نمبر ا

ابتدائی موقف: اسلامی نظام حکومت قائم ہونے کا ایک ہی راستہ ہے، جس کا خلاصہ مولانا مودودی مرحوم ہی کے الفاظ میں یہ ہے:

> ’’معاشرے کو جڑ سے ٹھیک کرنے کی کوشش کی جائے اور ایک عمومی تحریکِ اصلاح کے ذریعہ سے اس میں خالص اسلامی شعور اور ارادہ کو بتدریج اس حد تک نشو ونما دی جائے کہ جب وہ اپنی پختگی کو پہنچے تو خود بخود اس سے ایک مکمل اسلامی نظام وجود میں آ جائے۔‘‘

دوسرا موقف: تقسیم کے بعد اسلامی ریاست کے قائم ہونے کے ایک کی بجائے دو راستے ہو گئے۔ پہلا انتخاب اور دوسرا معاشرے کی جڑ سے درستگی۔ آخر میں صرف ایک ہی راستہ رہ گیا

☆ Saadi-edu@hotmail.com

اور وہ تھا انتخابی جِدّ و جُہد۔

نتیجہ نمبر ۲

ابتدائی موقف: یہ خیال بالکل غلط ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں حاکمیتِ جمہور (یعنی انتخاب) کے اصول پر خودمختار حکومت کا قیام آخر کار حاکمیّتِ ربّ العالمین کے قیام میں مددگار ہوسکتا ہے۔

دوسرا موقف: ۱۹۴۵ء میں رائے عامہ کے بل پر تبدیلی کی توقع کے ساتھ انتخابات میں حصّہ لینے پر رضامندی ظاہر کی گئی۔ تقسیم کے بعد انتخابات کے ذریعے اسلامی نظام زندگی کے قیام کے لیے جو دو طریقے بیان کیے گئے ہیں اس میں پہلا طریقہ انتخاب کا ہے۔

نتیجہ نمبر ۳

ابتدائی موقف: مسلمانوں کی آزاد حکومت بھی اسلامی نظام کے قیام کے لیے نہ صرف یہ کہ مددگار اور مفید نہیں ہوگی بلکہ کفار کی حکومت سے بھی زیادہ رکاوٹ اور سدِّراہ ہوگی۔

دوسرا موقف: اسی قومی حکومت (جس کے بارے میں کہا گیا تھا کہ وہ نہ صرف یہ کہ اسلامی نظام کے قیام میں مفید اور مددگار ثابت ہونے کی بجائے زیادہ ہی رکاوٹ اور سدِّراہ ہوگی) سے توقع کی جارہی ہے کہ وہ محسوس کرلیں کہ پاکستان قائم ہونے کے بعد ان کا کام ختم ہوگیا ہے۔ اس پر مولانا مرحوم کے مقام کے ادراک اور تمام ادب واحترام کے باوجود یہ کہے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ: ع ’’اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا!‘‘

نتیجہ نمبر ۴

ابتدائی موقف: مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم کر کے یہ توقع رکھنا بھی غلط ہے کہ اسے آہستہ آہستہ تعلیم وتربیت کر کے اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

دوسرا موقف: اب کہا جارہا ہے کہ ’’ریاست کے وسیع ذرائع اور طاقتوں کو استعمال کر کے پاکستان کے باشندوں میں ذہنی اور اخلاقی انقلاب برپا کرنا آسان ہوجائے گا۔‘‘

توجّہ: اگر اوپر کے اقتباسات کو ان کے اصل مآخذ سے ملاحظہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی کہ ان تمام نتائج کا تعلق اصولوں سے ہے نہ کہ حکمتِ عملی سے۔ جتنے واضح اور دوٹوک الفاظ میں یہ اصول بیان کیے گئے ہیں وہ بالکل نمایاں ہیں۔ یہ وضاحت ذہن میں رہے کیونکہ بعد میں ان اصولوں میں تبدیلی کے وقت ان کو حکمتِ عملی باور کروایا گیا ہے۔

دوسرا پہلو

اس پہلو کے تین زاویے ہیں:

(۱) جیسا کہ اوپر کے موازنے میں عرض کیا گیا ہے کہ تقسیم سے پہلے تبدیلی کا ایک ہی راستہ تھا لیکن تقسیم کے بعد دو راستے ہو گئے۔ ان میں سے بھی جو اصل راستہ تھا (معاشرے کو جڑ سے ٹھیک کرنا) وہ دوسرے نمبر پر چلا گیا اور وہ راستہ (یعنی جمہوری طریقے سے انتخاب) جس سے اسلامی حکومت کے قیام کو (تاریخ، سیاسیات، اجتماعیات، عقل اور تجربہ کی روشنی میں) ناممکنات میں شمار کیا گیا تھا، پہلے نمبر پر آ گیا۔ ۱۹۵۱ء میں انتخاب ہی تبدیلی کا واحد راستہ قرار پایا۔

(۲) ابتدا میں کہا گیا تھا کہ:

> ''پھر اگر رائے عامہ کی موافقت سے یا حالات کی تبدیلی سے کسی مرحلہ پر ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ موجود الوقت دستوری طریقوں ہی سے نظام حکومت کا ہمارے ہاتھ میں آ جانا ممکن ہو اور ہمیں توقع ہو کہ ہم سوسائٹی کے اخلاقی، تمدنی اور سیاسی و معاشی نظام کو اپنے اصولوں پر ڈھال سکیں گے تو ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔''

اور:

> ''لیکن اگر کسی وقت ہم ملک کی رائے عامہ کو اس حد تک اپنے عقیدہ و مسلک سے متفق پائیں کہ ہمیں توقع ہو کہ عظیم الشان اکثریت کی تائید سے ہم ملک کا دستور تبدیل کر سکیں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس طریقہ سے کام نہ لیں۔''

یعنی اگر ہمیں اس بات کی توقع ہو کہ نظام حکومت ہمارے ہاتھ میں آ جائے گا اور ہم ملک کا دستور تبدیل کر سکیں گے تو ہم انتخاب میں حصّہ لیں گے۔

۱۹۵۷ء میں اس اعتراض (کہ اس وقت اگر مرکزی اور صوبائی اسمبلی کی چند نشستیں حاصل کر بھی لی گئیں تو ان کا حاصل کیا ہوگا؟) کا جواب دیتے ہوئے مولانا صاحب نے کہا:

> ''اس وقت جماعت اسلامی صرف پبلک میں کام کر رہی ہے۔ جو با اختیار ادارے ملک کے نظام کو چلانے کی اصل طاقت رکھتے ہیں ان میں اس کا کوئی حصّہ نہیں ہے۔ اس لیے وہ اپنے تمام اخلاقی اور ذہنی اثرات کے باوجود یہاں کے حالات پر براہ راست اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ انتخابات میں چند نشستیں حاصل کر لینے کے بعد یہ پوزیشن بدلنا شروع ہو جائے گی۔''
>
> (تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل، صفحہ ۲۲۹)

کہاں یہ موقف کہ نظامِ حکومت ہاتھ میں آنے کی توقع پر انتخاب میں حصّہ لینے کا امکان اور

کہاں چند سیٹوں پر کامیابی کے امکان کی صورت میں بھی انتخاب میں حصّہ لینے پر آمادگی۔

اس تقریر میں مولانا صاحب نے فرمایا کہ:

’’یہ خیال کرنا بھی درست نہیں کہ یہ گروہ جتنی تعداد میں (اسمبلیوں کے) اندر جائے گا وہی اس کی تعداد اسمبلی کی عمر تمام ہونے تک رہے گی۔ میں اس کے برعکس یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہاں اس کی تعداد بڑھتی چلی جائے گی۔‘‘

قوموں کی تاریخ پڑھیں تو شاید یہ دلیل اس وقت بھی درست نہ تھی لیکن بعد کے حالات و واقعات نے تو بدیہی طور پر اس نظریے کو سراسر غلط ثابت کیا ہے۔

(۳) جب اسلامی نظام کے قیام کو دو طریقوں سے ممکن کہا گیا تھا' ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ:

’’ہم اس وقت پہلے طریقہ (بذریعہ انتخاب) کو آزما رہے ہیں۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہو گئے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ پاکستان کے قیام کے لیے ہماری قوم نے جو جِدّ و جُہد کی تھی وہ لاحاصل نہ تھی بلکہ اسی کی بدولت اسلامی نظام کے نصب العین تک پہنچنے کے لیے ایک سہل اور آسان ترین راستہ ہمارے ہاتھ آ گیا۔ لیکن اگر خدانخواستہ ہمیں اس میں ناکامی ہوئی اور اس ملک میں ایک غیر اسلامی ریاست قائم کر دی گئی تو یہ مسلمانوں کی ان تمام محنتوں اور قربانیوں کا صریح ضیاع ہوگا جو قیام پاکستان کی راہ میں انہوں نے کیں۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم پاکستان بننے کے بعد بھی اسی مقام پر ہیں جہاں پہلے تھے۔ اس صورت میں ہم پھر دوسرے طریقہ پر کام شروع کر دیں گے جس طرح پاکستان بننے سے پہلے کر رہے تھے۔‘‘

اوّل تو مولانا صاحب کے اپنے افکار کی روشنی میں جمہوری طریقے سے انتخاب کے ذریعے اسلامی نظام کا قیام ناممکنات میں سے تھا۔ لیکن اگر اس کے کسی بھی حد تک امکان کی توقع پر انتخابات میں حصّہ لینے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا تو یقیناً جماعت اسلامی کی مجالس شوریٰ میں اس بات کا جائزہ لیا جاتا رہا ہوگا کہ انتخاب کے ذریعے اسلامی نظام کے قیام کا امکان کس حد تک ہے۔ کیا کسی بھی وقت یہ محسوس نہیں کیا گیا کہ انتخابات کے ذریعے اسلامی نظام کا قیام ممکن نہیں۔ راقم کی رائے میں ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے نتائج نے ثابت کر دیا تھا کہ مروّجہ انتخابات کے ذریعے اسلامی نظام کا قیام ممکن نہیں۔

موقف میں تبدیلی کے جواز کا تجزیہ

موقف میں اس تبدیلی کا تفصیلی جواز مولانا مودودی نے ۱۹۵۷ء میں اپنی مشہور پالیسی تقریر (جو کہ ’’تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل‘‘ کے نام سے موجود ہے) میں پیش کیا ہے۔ مولانا صاحب

اس تقریر میں فرماتے ہیں:

''اب یہ بات آخر آپ میں سے کس سے چھپی ہوئی ہے کہ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک پہنچتے پہنچتے واقعات کی دنیا کس قدر بدل گئی؟[1] ۱۹۴۰ء میں جو راستہ اسلامی حکومت قائم کرنے کے لیے میں نے پیش کیا تھا' مسلمانوں نے بحیثیت مجموعی اسے اختیار نہیں کیا۔ وہ اسی ''درمیانی چیز'' کے لیے کوشاں رہے جسے میں نے پھیر کا راستہ کہا تھا' حتیٰ کہ بالآخر وہ ''لادینی جمہوری قومی ریاست'' پاکستان میں قائم ہوگئی جس کے متعلق میں نے یہ کہا تھا کہ وہ اسلامی نظامِ حکومت کے قیام میں مددگار ہونے کی بجائے سخت مزاحم ہوگی' اور اسے جمہوری طریقوں سے اسلامی ریاست میں تبدیل کرنا کوئی آسان کام نہ ہوگا۔[2] یہ سب کچھ پیش آجانے کے بعد اگر کوئی شخص مجھ سے یہ کہے کہ اس کے پیش آنے سے پہلے جن خطرات کا میں نے ذکر کیا تھا' اب مجھے ان کو دفع کرنے کی بجائے انہیں سچ کر دکھانے کی کوشش کرنی چاہیے تھی تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس کی معاملہ فہمی کی داد دوں یا سخن فہمی کی۔ بے شک میں نے کہا تھا کہ جاہلیت کے اصول پر مسلمانوں کی قومی ریاست بن جانا اسلامی حکومت کے قیام کا ذریعہ نہیں ہے اس لیے اس درمیانی چیز کے لیے کوشش کرنے کی بجائے اصل مقصد کے لیے براہِ راست کوشش کرو' مگر کیا اس کا یہ مطلب تھا یا اب لینا درست ہے کہ وہ درمیانی چیز جب قائم ہو جائے تو ہمیں اس کو اسلام کی راہ میں اتنا ہی اور ویسا ہی سخت مزاحم بن جانے دینا

---

(۱) نہیں معلوم کہ مولانا صاحب کی نظر میں ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک واقعات کی دنیا میں کیا تبدیلی آگئی تھی۔ کیا قوم کی اخلاقی حالت میں کوئی نمایاں تبدیلی آگئی تھی؟ یا اس وقت کی مسلمانوں کی قیادت کی سوچ یا عمل میں کوئی تغیر واقع ہوگیا تھا؟ ایک تغیر ہوا تھا جو بقول مولانا صاحب مسلمانوں کی کافرانہ حکومت کا قیام تھا۔

(۲) جی نہیں۔ یہ نہیں کہا گیا تھا کہ اُسے تبدیل کرنا آسان نہ ہوگا بلکہ یہ کہا گیا تھا:

''بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز کا ہی سہی مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہوجائے' پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعے سے اس کو اسلامی ریاست (اسٹیٹ) میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ' سیاسیات اور اجتماعیات کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر اس کو ناممکن سمجھتا ہوں'' اور ''پس جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہوجائے تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہوجائے گی' ان کا گمان غلط ہے اور اس کا جواب عقل اور تجربہ دونوں کی روشنی میں نفی کے سوا کچھ نہیں دیا جاسکتا۔''

چاہیے‘ اور اسے اسلامی نظام کے قیام کا ذریعہ بنانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے؟‘‘

اقتباس طویل ہو جائے گا‘ اس لیے جو لوگ دلچسپی رکھتے ہوں وہ اس کا اصل ماخذ (تحریک اسلامی کا آئندہ لائحۂ عمل‘ صفحات ۱۱۵ تا ۱۱۷) ملاحظہ فرمائیں۔

واضح رہے کہ یہ وضاحت ۱۹۵۷ء میں کی جارہی ہے جب کہ اس وقت تک درج ذیل واقعات ہو چکے تھے۔ کیا اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی اس بارے میں دو رائے تھیں کہ جن اندیشوں اور خطرات کا اظہار کیا گیا تھا وہ درست ہیں یا نہیں!

(۱) قائداعظم کے انتقال کے ۲۲ دن بعد ہی ۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو مولانا مودودی صاحب کو پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کرلیا گیا تھا۔ ان کے ساتھ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اور میاں طفیل محمد صاحب بھی نظر بند کیے گئے تھے۔ اپریل ۱۹۴۹ء میں مولانا مودودی اور ان کے ساتھیوں کی میعادِ نظر بندی میں چھ ماہ کی توسیع کر دی گئی تھی اور وہ ۲۸ مئی ۱۹۵۰ء تک نظر بند رہے۔ (روداد جماعت اسلامی‘ حصہ ششم‘ صفحہ ۱۳۳)

قراردادِ مقاصد کی منظوری پر مجبور کرنے کا ’’جرم‘‘ جماعت اسلامی نے کیا تھا اس کی پاداش میں مولانا مودودی اور ان کے ساتھیوں کی میعادِ نظر بندی میں مسلسل اضافہ کیا جانے لگا۔ (روداد جماعت اسلامی‘ حصہ ششم‘ صفحہ ۱۰۹)

۱۹۴۸ء ہی کے آخر میں رسالہ ’’ترجمان القرآن‘‘ اپنے ایڈیٹر‘ پرنٹر اور پبلشر مولانا مودودی کی نظر بندی کی وجہ سے بند تھا۔ رسالہ ’’چراغ راہ‘‘ کراچی کے ایڈمنسٹریٹر کے سیفٹی لاء کی نذر ہو چکا تھا۔ جماعت کے حامی سہ روزہ ’’کوثر‘‘ اور روزنامہ ’’تسنیم‘‘ اگرچہ پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت چھ ماہ بند رہ کر ۲۳ فروری کو بحال ہو چکے تھے‘ لیکن اپنے مالی اور دوسرے نقصانات کی وجہ سے نڈھال تھے۔ (روداد جماعت اسلامی‘ حصہ ششم‘ صفحات ۱۰۷ و ۱۰۸)

۱۹۴۹ء ہی میں جماعت اسلامی صوبہ سرحد کے بہترین کارکنوں میں سے ۸/۱۰ وہاں کی جیلوں میں بند تھے۔ صوبے میں ہر قسم کی اجتماعی سرگرمیوں پر دوسرے صوبوں سے بھی شدید تر پابندیاں عائد تھیں۔ (کتاب محولہ بالا‘ صفحہ ۹۹)

> ’’اب صوبہ سرحد کے انتخابات ہو رہے ہیں۔ صوبے میں ہمارے سب سے بااثر کارکن اور مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن سردار علی خان صاحب اور ایک دوسرے شمس القمر صاحب کو دفعہ ۴۰ سرحد کے تحت اکتوبر کے آخر میں گرفتار کیا جا چکا ہے۔ (حاشیہ میں درج ہے) ان کے چند روز بعد جماعت کے ایک اور بااثر رکن ارباب نعمت اللہ خان صاحب کو بھی جنہیں علاقہ

کی پنچایت نے سرحد اسمبلی کے لیے نامزد کیا تھا‘ گرفتار کر لیا گیا۔ سردار علی خان صاحب کو سیفٹی ایکٹ کے تحت ایک سال کے لیے قید کر دیا گیا۔‘‘(روداد جماعت اسلامی‘ حصّہ ششم‘صفحہ ۱۲۱)

گرفتاریوں کی مزید تفصیل اسی کتاب کے صفحہ ۱۳۴ پر ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

(۲) نومبر ۱۹۴۹ء‘ جنوری ۱۹۵۰ء‘ جون ۱۹۵۰ء‘ ستمبر ۱۹۵۰ء‘ مارچ ۱۹۵۱ء اور جولائی ۱۹۵۱ء میں وزارت داخلہ‘ فوجی ہیڈکوارٹر راولپنڈی اور مختلف صوبائی حکومتوں کی طرف سے خاص ہدایات اور احکام جاری کیے گئے کہ جماعت اسلامی ایک سیاسی جماعت ہے۔ سرکاری ملازموں کو نہ اس کی کارروائی میں شریک ہونا چاہیے‘ نہ اس کی مالی مدد کرنی چاہیے‘ نہ اس کی کوئی چیز پڑھنی یا سننی چاہیے‘ نہ اس کے کام یا کارکن سے کوئی واسطہ رکھنا چاہیے‘ اور نہ اپنے گھر کے لوگوں کو اس سے کسی تعاون کی اجازت دینی چاہیے‘ ورنہ قواعدِ ملازمت کے تحت ان کے خلاف سخت انضباتی کارروائی کی جائے گی‘ جس کے نتیجے میں عہدے سے تنزلی کی سزا بھی دی جاسکتی ہے اور برخاست بھی کیا جاسکتا ہے۔ بعض سرکلروں میں حکومت کی طرف سے اس سختی کے جواز میں جماعت کا جرم یہ بتایا گیا کہ:’’اس جماعت کے مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد پاکستان میں شرعی حکومت کا قیام ہے۔‘‘

ان احکام سے پہلے بھی دسمبر ۱۹۴۸ء میں یہ حکم دیا گیا تھا کہ جماعت کے لٹریچر کا کوئی پرزہ بھی کسی چھاؤنی کی حدود میں داخل نہ ہونے پائے............ اور مذکورہ احکام کے دو سال بعد مرکزی وزارتِ داخلہ نے بڑے قہر کے انداز میں پھر حکم نامہ جاری کیا کہ باوجود بار بار توجہ دلانے کے‘ جماعت اسلامی کے ہم خیال لوگ ہر جگہ بدستور کام کر رہے ہیں۔ سب محکموں کے اعلیٰ افسروں کو چاہیے کہ اپنے ماتحت لوگوں کو سختی سے متنبہ اور منع کریں۔ (روداد جماعت اسلامی‘ حصّہ ششم‘ صفحات ۱۳۵ و ۱۳۶)

(۳) اس کے بعد (سابق) صوبہ پنجاب میں ڈائریکٹ ایکشن سے پیدا شدہ صورت حال کا بہانہ بنا کر ۲۸ مارچ ۱۹۵۳ء کو جماعت اسلامی پر ہاتھ ڈالا گیا اور اس پر ایک ایسی کاری ضرب لگانے کا ارادہ کیا گیا کہ اگر یہ ختم نہ بھی ہو تو ایک مدّت تک سر نہ اٹھا سکے۔

لاہور میں مارشل لاء کے دنوں میں امیر جماعت اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو ۲۸ مارچ ۱۹۵۳ء کو بغیر کسی معقول وجہ کے گرفتار کر کے پہلے پھانسی پر لٹکانے کی اور اس کے بعد چودہ سال قید بامشقت میں رکھنے کی کوشش کی گئی۔

اسی زمانے میں مولانا مودودی صاحب اور (مجلس شوریٰ کے بیشتر ارکان سمیت) ۵۴ دوسرے

اہم کارکنوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ لاہور میں گرفتار کیے جانے والوں کے خلاف فوجی عدالت کے روبرو پیش کرنے کے لیے جب کوئی الزام نہ مل سکا اور فوجی حکام نے یکے بعد دیگرے دومرتبہ تحقیقات کے بعد ان کی رہائی کے احکام جاری کر دیے تو انہیں سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیا گیا۔ اسی سلسلے کی مزید کارروائیوں کے لیے ملاحظہ فرمائیں: روداد جماعت اسلامی‘ حصہ ہفتم‘ صفحہ ۸۰ و ۸۱)

اس دوران میں پہلے ایک من مانا دستور آرڈیننس کے ذریعے نافذ کرنے کی کوشش کی گئی .... تو موجودہ دستور یہ وجود میں لائی گئی .... ان اعلانات کے چند ہی روز بعد ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو یکا یک یہ خبر آئی کہ گورنر جنرل نے دستور یہ کو توڑ دیا ہے اور حکمرانی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں۔ ساتھ ہی پورے ملک میں شدید سنسر شپ عائد کر دی گئی۔ ملک میں سناٹا چھا گیا اور مارشل لاء کی سی کیفیت پیدا ہوگئی۔ صاف نظر آنے لگا کہ پاکستان سے اسلام ہی نہیں جمہوریت کو بھی ہمیشہ کے لیے رخصت کر دیا گیا ہے ....

دستور یہ کو توڑنے کے کے پیچھے اصل ارادہ کیا کارفرما تھا‘ وہ ایک ہفتہ کے اندر اندر ان اعلانات اور بیانات کے ذریعے سامنے آ گیا جو اسلام اور اسلامی دستور کے سلسلے میں یکے بعد دیگرے نئے ذمہ داران کی طرف سے پریس میں آئے۔ جماعت اسلامی کو نام لے لے کر سخت سے سخت دھمکیاں دی گئیں کہ وہ اپنی سرگرمیوں کو مذہبی حدود تک محدود رکھے‘ بلکہ صاف صاف کہا گیا کہ اگر تم لوگ مذہب کو سیاست میں دخیل بنانے سے باز نہیں آ ؤ گے تو تمہیں کچل کر رکھ دیا جائے گا۔

(۴) قرار دادِ مقاصد کے متعلق امیر جماعت اسلامی مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی ایک تقریر میں ٹھیک فرمایا تھا کہ:

> ’’یہ ایک ایسی عجیب (انوکھی) بارش تھی کہ نہ اس سے پہلے گھٹا اٹھی اور نہ اس کے بعد کوئی روئیدگی نمودار ہوئی۔ عوامی دباؤ کے تحت یہ قرارداد پاس تو کر دی گئی لیکن اس کے بعد نہ دستور سازوں اور نہ حکمرانوں کی طرف سے کوئی ایسی بات ظہور میں آئی جو پتا دیتی ہو کہ وہ فی الواقع اس کے مطابق پاکستان کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے برعکس ان کی ساری سرگرمیوں سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ اس قرارداد کے پاس کرنے سے ان کا مقصد عوام کی بے چینی دور کر دینے کے سوا کچھ اور نہ تھا۔‘‘ (روداد جماعت اسلامی‘ حصہ ششم‘ صفحہ ۱۰۷ و ۱۰۸)

اس سے بھی بڑھ کر مولانا صاحب نے نومبر ۱۹۵۱ء میں فرمایا:

> ’’آخر میں ایک نہایت اہم مسئلہ ملک کے دستور کا ہے جو چار سوا چار سال سے ٹل رہا ہے۔ اس

معاملے میں ہمارے اربابِ اقتدار کی روش ایک مسلسل وجہِ تشویش بنی ہوئی ہے۔ وہ ابتدا سے ملک کا دستور ملک کے باشندوں کی تمنّاؤں اور آرزوؤں کی بجائے اپنی مرضی کے مطابق بنانے پر تلے رہے ہیں۔ پہلے انیس مہینے تک وہ اس بات کو ٹالتے رہے کہ اسلام کو دستور کی بنیاد قرار دینے کا سرکاری طور پر اعلان کریں۔ پھر جب لوگوں نے ہر طرف سے مطالبہ کیا تو مجبوراً قراردادِ مقاصد پاس کی۔''

پھر فرمایا:

''جیسا کہ میں اس سے پہلے اپنی ایک تقریر میں کہہ چکا ہوں (مندرجہ بالا الفاظ) اگر حقیقت میں ان کے اپنے مقاصد بھی وہی ہوتے جو انہوں نے اس قرارداد میں بیان کیے تھے تو اس سے پہلے کچھ آثار ایسے پائے جانے چاہئیں تھے جو پتا دیتے کہ اسلامی نظامِ زندگی کو برپا کرنے کے لیے ملک کے سربراہ کاروں میں کوئی رجحان پیدا ہو رہا ہے لیکن بارش سے پہلے اس طرح کی کوئی گھٹا اٹھتی نہ دیکھی گئی۔ پھر کم از کم اتنا تو ہونا چاہیے تھا کہ قرارداد پاس کر لینے کے بعد حکام کے رویہّ میں، حکومت کی پالیسی میں، ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی دفعات میں، ملک کے قوانین میں، تعلیم کے نظام میں، سول سروس وغیرہ کے طریقِ تربیت میں اور فوج کے طور طریقوں میں اسلام کے منشا کے مطابق کوئی تبدیلی رونما ہونا شروع ہو جاتی۔ مگر اس اتفاقی بارش کے بعد ایسی کوئی روئیدگی بھی کسی طرف سے ابھرتی نظر نہیں آئی۔ بس ایک جادو کی سی برسات تھی جو مداری نے لوگوں کے مطالبے پر برسا دی۔

مارچ ۱۹۴۹ء (یعنی قرار دادِ مقاصد کی منظوری کے وقت) سے ستمبر ۱۹۵۰ء تک پورے ۱۹ مہینے پھر اس انتظار میں گزر گئے کہ قراردادِ مقاصد کی تفسیر ایک تفصیلی دستور کی شکل میں کیا پیش کی جاتی ہے۔ آخر کار وہ سفارشات ہمارے سامنے آئیں جو بنیادی حقوق اور بنیادی اصولوں کے متعلق دستور ساز اسمبلی کی مقرر کردہ کمیٹیوں نے مرتب کی تھیں اور یہ دیکھ کر سارا ملک حیران رہ گیا کہ وہ دراصل قراردادِ مقاصد کی تفسیر نہیں بلکہ عملاً اس کی تنسیخ تھیں۔ ان میں اسلام اور جمہوریت دونوں پر کچھ اس بے دردی کے ساتھ چھری چلائی گئی تھی کہ ملک کے سارے گروہ اس پر چیخ اٹھے......اور معاملہ پھر کمیٹیوں کے حوالے کر دیا گیا جس پر آج چودہ مہینے گزر چکے ہیں۔

اب سنا جا رہا ہے کہ ''عالَمِ بالا'' میں پھر اسی طرح کی نئی سازش کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے جیسی ۱۹۴۸ء میں نظامِ اسلامی کے مطالبے کو روکنے کے لیے کی گئی تھی......اب پھر یہ غلط

اندازہ کیا جا رہا ہے کہ اپنے حسبِ منشا دستور بنا کر نافذ کرنے میں اگر کوئی ان کی راہ کا روڑا بن سکتا ہے تو وہی چند اشخاص ہیں۔ چنانچہ ان کو ہٹانے کے لیے پھر کچھ تدبیریں سوچی جا رہی ہیں۔'' (روداد جماعت اسلامی' حصہ ششم' صفحہ ۸۷و۸۸)

اللہ تعالیٰ سے اس دعا کے ساتھ کہ شیطان کے شر سے محفوظ رکھے' انہی چند سطروں میں دیکھیں کہ کتنا تضاد ہے۔ اس قیادت کے بارے میں تقسیم سے پہلے کے تبصرے پڑھ لیں۔ پھر انہی سطروں میں آپ کہتے ہیں کہ انہوں نے یہ قرارداد مجبوراً پاس کی ہے اور اس لیے پاس کی ہے کہ عوام کی بے چینی دور ہو جائے۔ پھر آپ یہ توقع بھی رکھتے ہیں کہ اس کی منظوری کے بعد یہ اور یہ تبدیلیاں آنی شروع ہو جانی چاہئیں تھیں۔

''تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل'' میں پالیسی کی تبدیلی کی بنیاد تین چیزوں پر ہے: (۱) قراردادِ مقاصد (۲) مسلم اکثریت کے بل پر انتخابات کے ذریعے (۳) تبدیلیٔ قیادت۔

جہاں تک قراردادِ مقاصد کا تعلق ہے اس کی حقیقت کے بارے میں اوپر لکھا جا چکا ہے۔ مسلم اکثریت کی اخلاقی حالت (ضمیمہ نمبر ۱) اور انتخابات (ضمیمہ نمبر ۲) کے بارے میں مولانا مودودی مرحوم کی رائے علیحدہ سے ایک ضمیمے کے طور پر دی جا رہی ہے۔ یہاں ایک مختصر سا اقتباس دینا مقصود ہے۔

''رہے عام تعلیم یافتہ لوگ تو ان کی بے حسی کا اندازہ اس سے کر لیجیے کہ پنجاب کے پچھلے انتخابات میں' جبکہ پانچ سال کے لیے صوبے کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا' ان کی بمشکل ۲ فی صد آبادی ووٹ دینے کے لیے آئی۔ عوام کی رائے کو تیار کرنے میں تو ان کے ۲۵ فیصد حصے نے بھی مشکل ہی سے کوئی دلچسپی لی ہوگی۔ باقی سب اس سوال سے بالکل بے پروا تھے کہ کن لوگوں کے ہاتھ میں آئندہ پانچ سال کے لیے صوبے کے انتظام کی باگیں دی جاتی ہیں۔ گویا یہ انتخاب کہیں اور ہو رہے تھے' اور ان کا کوئی اچھا یا برا اثر خود ان کی زندگی پر تو پڑنا ہی نہیں تھا۔ غور کیجیے کہ جس ملک کے اہل دماغ طبقے کا یہ حال ہو اس کو تنزل اور تباہی کی طرف جانے سے کون روک سکتا ہے۔'' (روداد جماعت اسلامی' حصہ ششم' صفحہ ۹۳)

اوپر کیے گئے تجزیے کا محور یہ ہے کہ جب معاشرے کو جڑ سے ٹھیک کرنے کی بجائے انتخاب کے ذریعے اسلامی نظام کے قیام کے راستے کو اختیار کر لیا گیا تو پھر اس کے مطابق ہی بیانات میں بھی تبدیلی کرنا پڑی۔ ذیل میں صرف تین مثالیں دی جا رہی ہیں۔ پہلے معاشرے کو جڑ سے ٹھیک کرنا پیش نظر تھا اس لیے مرض کی صحیح تشخیص کی جا رہی تھی' لیکن اب چونکہ رائے عامہ کے بل پر انتخابات

میں کامیابی پیش نظر تھی اس لیے عوام کو معصوم اور اسلام پسند قرار دیا گیا۔ اس لیے اپنی ہی تشخیص کے برعکس بیانات دیے گئے۔

نکتہ ۱

پہلا موقف

’’مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ان کا سوادِ اعظم اسلامی تہذیب اور اس کی اسلامی خصوصیات سے ناواقف ہے‘ حتیٰ کہ اس میں ان حدود کا شعور تک باقی نہیں رہا ہے جو اسلام کو غیر اسلام سے ممیز کرتی ہیں............ ان کا قومی کردار اب مردانہ نہیں رہا بلکہ زنانہ بن گیا ہے.......... ہر طاقتور ان کے خیالات کو بدل سکتا ہے‘ ان کے عقائد کو پھیر سکتا ہے‘ ان کی ذہنیت کو اپنے سانچے میں ڈھال سکتا ہے‘ ان کی زندگی کو اپنے رنگ میں رنگ سکتا ہے۔ ان کے اصول حیات میں اپنی مرضی کے مطابق جیسا چاہے تغیر و تبدّل کر سکتا ہے۔ اوّل تو وہ اتنا علم نہیں رکھتے کہ یہ امتیاز کر سکیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم کس خیال اور کس عملی طریقے کو قبول کر سکتے ہیں اور کس کو نہیں۔ دوسرے ان کی قومی تربیت اتنی ناقص ہے کہ ان کے اندر کوئی اخلاقی طاقت ہی باقی نہیں رہی۔ جب کوئی چیز قوت کے ساتھ آتی اور گرد و پیش میں پھیل جاتی ہے تو وہ خواہ کتنی ہی غیر اسلامی ہو‘ یہ اس کی گرفت سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے اور غیر اسلامی جاننے کے باوجود طوعاً و کرہاً اس کے آگے سپر ڈال دیتے ہیں....... ہماری سوسائٹی میں اتنی قوت ہی نہیں رہی کہ وہ اپنے افراد کو اس کے باہر قدم رکھنے سے باز رکھ سکے۔‘‘

(۱۹۳۷ء‘ تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان‘ حصہ دوم‘ صفحہ ۵۴)

دوسرا موقف

’’اگر ہم اپنے دشمن نہیں ہیں تو ہمیں بہر حال یکسو ہو جانا چاہیے۔ اس یکسوئی کی صرف دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ ہم کو دیکھنا ہے کہ ہم میں سے کون کس صورت کو پسند کرتا ہے۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ ہمارے سابق حکمرانوں نے اور ان کی غالب تہذیب نے جس راستے پر اس ملک کو ڈالا تھا‘ اسی کو اختیار کر لیا جائے۔ پھر خدا‘ آخرت‘ دین اور دینی تہذیب و اخلاق کا خیال چھوڑ کر ایک خالص مادہ پرستانہ تہذیب کو نشوونما دی جائے تا کہ یہ ملک بھی ایک دوسرا روس یا امریکہ بن سکے۔ مگر علاوہ اس کے کہ یہ راہ غلط ہے‘ خلافِ حق ہے اور تباہ کن ہے‘ مَیں کہوں گا کہ پاکستان میں اس کا کامیاب ہونا ممکن بھی نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہاں کی نفسیات

اور روایات میں اسلام کی محبت اور عقیدت اتنی گہری جڑیں رکھتی ہے کہ انہیں اکھاڑ پھینکنا کسی انسانی طاقت کے بس کی بات نہیں۔‘‘

(۱۹۵۱ء‘ روداد جماعت اسلامی‘ حصہ ششم‘ صفحہ ۴۰۰)

نکتہ ۲

پہلا موقف

’’ایک قوم کے تمام افراد کو محض اس وجہ سے کہ وہ نسلاً مسلمان ہیں‘ حقیقی معنوں میں مسلمان فرض کر لینا اور یہ امید رکھنا کہ ان کے اجتماع سے جو کام بھی ہوگا اسلامی اصول پر ہی ہوگا‘ پہلی اور بنیادی غلطی ہے۔ یہ انبوہ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے‘ اس کا حال یہ ہے کہ اس کے نوسو ننانوے (۹۹۹) فی ہزار (۱۰۰۰) افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔ نہ ان کا اخلاقی نقطہ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان نام ملتا چلا آ رہا ہے اس لیے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انہوں نے حق کو حق جان کر اسے قبول کیا ہے‘ نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ ان کی کثرتِ رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے۔‘‘

(جنوری ۱۹۴۱ء‘ تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان‘ حصہ دوم‘ صفحہ ۱۴۰)

دوسرا موقف

’’یکسوئی کی دوسری صورت یہ ہے کہ ہم اپنی انفرادی اور قومی زندگی کے لیے اُس راہ کا انتخاب کر لیں جو قرآن اور سنت محمد ﷺ نے ہم کو دکھائی ہے۔ یہی ہم چاہتے ہیں اور یہی ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی مسلم آبادی کے کم از کم نوسو ننانوے (۹۹۹) فی ہزار (۱۰۰۰) باشندے چاہتے ہیں‘ اور یہی ہر اس شخص کو چاہنا چاہیے جو خدا اور رسول کو مانتا ہو اور زندگی بعد موت کا بھی قائل ہو۔‘‘ (نومبر ۱۹۵۱ء‘ روداد جماعت اسلامی‘ حصہ ششم‘ صفحہ ۴۰۱)

نکتہ ۳

پہلا موقف

’’یہ لوگ کہتے ہیں کہ برطانوی نظامِ اطاعت اسلامی نصب العین کی راہ کی بڑی رکاوٹ ہے‘ ہم تنہا اس رکاوٹ کو دور نہیں کر سکتے‘ اس لیے پہلے دوسروں کی مدد سے اس کو دور کر لیں‘ پھر اصل منزل مقصود کی طرف بڑھنے کا راستہ آسان ہو جائے گا۔ مگر میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ راستہ آسان کیسے ہو جائے گا؟ ظاہر بات ہے کہ ایک نظامِ اطاعت یا دین کو ہٹا کر اس کی جگہ

دوسرا نظامِ اطاعت یا دین کبھی قائم نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ نفوسِ انسانی میں پہلے نظام کی تخریب اور دوسرے نظام کی تعمیر کا خیال اور ارادہ کمال درجہ قوت کے ساتھ مستحکم نہ کر دیا جائے۔'' (جنوری ۱۹۴۰ء' اسلام کی راہ راست اور اس سے انحراف کی راہیں: تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان' حصہ دوم' صفحہ ۱۳۵)

دوسرا موقف

''۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے کی صورت حال تو یہ تھی کہ ہمارے اوپر ایک غیر مسلم اقتدار مسلّط تھا' اس وجہ سے ہم اسلامی خطوط پر اپنی ملت کی تعمیر میں ریاست اور اس کی طاقتوں اور اس کے ذرائع سے کوئی مدد نہیں پا رہے تھے .... اب جو سیاسی انقلاب ۱۵ اگست کو رونما ہوا ہے اس کے بعد ہمارے سامنے یہ سوال پیدا ہو گیا ہے کہ آیا اب ہماری قومی ریاست اسلامی زندگی کی تعمیر میں وہ حصہ لے گی جو ایک معمار کا حصہ ہوتا ہے؟........ اس وقت چونکہ پاکستان کا آئندہ نظام زیرِ تشکیل ہے اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ ایسی ریاست بن جائے جو اسلامی زندگی کی معمار بن سکے۔ ہماری یہ خواہش اگر پوری ہو گئی تو ریاست کے وسیع ذرائع اور طاقتوں کو استعمال کر کے پاکستان کے باشندوں میں ذہنی اور انقلابی انقلاب برپا کرنا آسان ہو جائے گا۔ پھر جس نسبت سے ہمارا معاشرہ بدلتا جائے گا اسی نسبت سے ہماری ریاست بھی ایک مکمل اسلامی ریاست بنتی چلی جائے گی۔''

(جون ۱۹۵۸ء' تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان' حصہ دوم' صفحہ ۳۳۳ و ۳۳۴)

یہاں ایک اور وضاحت ہو جائے تو شاید نامناسب نہ ہو' کہ مختلف ادوار میں جو سوال اٹھتا رہا ہے کہ طاقت کے ذریعے انقلاب لے آیا جائے وہ بھی دراصل نصب العین کی ترجیح میں تبدیلی ہی کا نتیجہ ہے۔ جب اسلامی نظام کے قیام کو مقصد اور نصب العین قرار دے دیا گیا تو اُس کے لیے انتخاب ہی واحد راستہ قرار پایا جبکہ انتخابات کے نتائج سے کوئی خاطر خواہ کامیابی ہوتی نظر نہیں آئی تو یہ سوال پیدا ہونا شروع ہوا کہ طاقت کے زور پر انقلاب لے آیا جائے۔

دو ضمیمے بھی اس پورے تجزیے کے ساتھ دیے گئے ہیں: (۱) مسلمانوں کی اخلاقی حالت' اور (۲) انتخابات کے بارے میں مولانا مودودی صاحب کی رائے۔ ان کی اہمیت اس لحاظ سے بہت زیادہ ہے کہ جس رائے عامہ کے بل پر اور جن انتخابات کے ذریعے مولانا مودودی صاحب اسلامی نظام قائم کرنا چاہ رہے تھے ان دونوں کے بارے میں خود ان کی رائے کیا تھی۔

ضمیمہ ا: مسلمانوں کی اخلاقی حالت

جس رائے عامہ کے بل پر نظام کی تبدیلی کی کوششوں کا تذکرہ کیا گیا ہے‘ مختلف مواقع پر اس رائے عامہ کے تجزیے خود مولانا صاحب کی اپنی تحریروں کی روشنی میں:

(۱) ’’مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ان کا سوادِ اعظم اسلامی تہذیب اور اس کی اسلامی خصوصیات سے ناواقف ہے‘ حتیٰ کہ اس میں ان حدود کا شعور تک باقی نہیں رہا ہے جو اسلام کو غیر اسلام سے ممیز کرتی ہیں............ ان کا قومی کردار اب مردانہ نہیں رہا بلکہ زنانہ بن گیا ہے............ ہر طاقتور ان کے خیالات کو بدل سکتا ہے‘ ان کے عقائد کو پھیر سکتا ہے‘ ان کی ذہنیت کو اپنے سانچے میں ڈھال سکتا ہے‘ ان کی زندگی کو اپنے رنگ میں رنگ سکتا ہے۔ ان کے اصولِ حیات میں اپنی مرضی کے مطابق جیسا چاہے تغیّر وتبدل کر سکتا ہے۔ اوّل تو وہ اتنا علم نہیں رکھتے کہ یہ امتیاز کر سکیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم کس خیال اور کس عملی طریقے کو قبول کر سکتے ہیں اور کس کو نہیں۔ دوسرے ان کی قومی تربیت اتنی ناقص ہے کہ ان کے اندر کوئی اخلاقی طاقت ہی باقی نہیں رہی۔ جب کوئی چیز قوت کے ساتھ آتی اور گرد و پیش میں پھیل جاتی ہے تو وہ خواہ کتنی ہی غیر اسلامی ہو‘ یہ اس کی گرفت سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے اور غیر اسلامی جاننے کے باوجود طوعاً و کرہاً اس کے آگے سپر ڈال دیتے ہیں...... ہماری سوسائٹی میں اتنی قوت ہی نہیں رہی کہ وہ اپنے افراد کو حدودِ اسلامی کے باہر قدم رکھنے سے باز رکھ سکے...... افراد کو قابو میں رکھنا تو درکنار‘ ہماری سوسائٹی تو اب افراد کے پیچھے چل رہی ہے۔ پہلے چند سرکش افراد اسلامی قانون کے خلاف بغاوت کرتے ہیں‘ سوسائٹی چند روز اس پر ناک بھوں چڑھاتی ہے‘ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہی بغاوت ساری قوم میں پھیل جاتی ہے۔‘‘

(۲) ’’کوئی بڑی سے بڑی قومی مصیبت بھی آج مسلمانوں کے رہنماؤں اور ان کے قومی کارکنوں کو اتحادِ عمل اور مخلصانہ اور بے غرضانہ عمل پر آمادہ نہیں کر سکتی............ ان کے اندر اتنی زندگی تو ضرور باقی ہے کہ جب کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو تڑپ اٹھتے ہیں‘ مگر وہ اخلاقی اوصاف باقی نہیں جن کی بدولت یہ قومی مفاد کی حفاظت کے لیے اجتماعی کوشش کر سکیں۔ ان میں اتنی تمیز نہیں کہ صحیح رہنما کا انتخاب کر سکیں۔ ان میں اطاعت کا مادہ نہیں کہ کسی کو رہنما تسلیم کرنے کے بعد اس کی بات کو مانیں اور اس کی ہدایت پر چلیں۔ ان میں اتنا ایثار نہیں کہ کسی بڑے مقصد کے لیے اپنے ذاتی مفاد‘ اپنی رائے‘ اپنی آسائش‘ اپنے مال اور اپنی جان کی قربانی کسی حد تک بھی گوارا کر سکیں۔‘‘

(۳) ’’افلاس‘ جہالت اور غلامی نے ہمارے افراد کو بے غیرت اور بندۂ نفس بنا دیا ہے۔ وہ

روٹی اور عزّت کے بھوکے ہو رہے ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ جہاں کسی نے روٹی کے چند ٹکڑے اور نام ونمود کے چند کھلونے پھینکے‘ یہ کتوں کی طرح ان کی طرف لپکتے ہیں اور اس کے معاوضے میں اپنے دین وایمان‘ اپنے ضمیر‘ اپنی غیرت وشرافت‘ اپنی قوم وملت کے خلاف کوئی خدمت بجالانے میں ان کو کوئی باک نہیں ہوتا۔ مسلمان کا ایمان جو کبھی سارے جہان کی دولت سے بھی زیادہ قیمتی تھا‘ آج اتنا سستا ہوگیا ہے کہ ایک حقیر سی تنخواہ اسے خرید سکتی ہے‘ ایک ادنیٰ درجہ کی کرسی پر وہ قربان ہوسکتا ہے‘ ایک آبرو باختہ عورت کے قدموں پر وہ نثار کیا جاسکتا ہے...... گزشتہ ڈیڑھ سو برس کا تجربہ بتا رہا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دشمنوں نے جو کچھ کرنا چاہا اس کے لیے ان کو خود مسلمانوں ہی کی جماعت سے ایک دو نہیں ہزاروں اور لاکھوں خائن اور غدار مل گئے جنہوں نے تقریر سے‘ تحریر سے‘ ہاتھ اور پاؤں سے حتیٰ کہ تلوار اور بندوق تک سے اپنے مذہب اور قوم کے مقابلہ میں دشمنوں کی خدمت کی۔“

(۴) ”ہماری قوم میں منافقین کی بھی ایک بڑی جماعت شامل ہے اور ان کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ بکثرت اشخاص‘ تعلیم یافتہ‘ صاحبِ قلم‘ صاحبِ زبان‘ صاحبِ مال وزر‘ صاحبِ اثر ایسے ہیں جو دل سے اسلام اور اس کی تعلیمات پر یقین نہیں رکھتے مگر نفاق اور قطعی بے ایمانی کی راہ سے مسلمانوں کی جماعت میں شریک ہیں۔ یہ اسلام سے عقیدۃً اور عملاً نکل چکے ہیں مگر اس سے براءت کا صریح اعلان نہیں کرتے‘ اس لیے مسلمان ان کے ناموں سے دھوکا کھا کر انہیں اپنی قوم کا آدمی سمجھتے ہیں‘ ان سے شادی بیاہ کرتے ہیں‘ ان سے معاشرت کے تعلقات رکھتے ہیں اور ان زہریلے جانوروں کو اپنی جماعت میں چل پھر کر اور رہ بس کر زہر پھیلانے کا موقع دے رہے ہیں............ آنکھیں کھول کر دیکھیے کہ یہ منافقین کیسا مہلک زہر ہماری قوم میں پھیلا رہے ہیں۔ یہ اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں‘ اس کی اساسی تعلیمات پر حملے کرتے ہیں‘ مسلمانوں کو دہریت اور الحاد کی طرف دعوت دیتے ہیں‘ ان میں بے دینی اور بے حیائی اور قانونِ اسلامی کی خلاف ورزی کو نہ صرف عملاً پھیلاتے ہیں بلکہ کھلم کھلا زبان وقلم سے اس کی تبلیغ کرتے ہیں۔ ان (مسلمانوں) کی تہذیب کو مٹانے کی ہر کوشش میں آپ دیکھیں گے کہ یہ دشمنوں سے چار قدم آگے ہیں۔ ہر وہ اسکیم جو اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی کے لیے کہیں سے نکلی ہو‘ اس کو مسلمانوں کی جماعت میں نافذ کرنے کی خدمت یہی ناپاک گروہ اپنے ذمہ لے لیتا ہے۔“

(۱۹۳۷ء‘ تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان‘ حصہ اول‘ صفحہ ۵۴ تا ۵۷)

(۵) ’’جس قوم میں خود زندہ رہنے اور اپنی زندگی اپنے بل بوتے پر قائم رکھنے کی صلاحیت نہیں‘ اس کو دوسرے کب تک زندہ رکھ سکیں گے .... رہا دوسرا گروہ تو وہ آزادی کے جوش میں اپنی قوم کی ان بنیادی کمزوریوں کو بھول جاتا ہے جنہیں ہم گزشتہ صفحات میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ وہ کمزوریاں واقعی نہیں ہیں اور مسلمان اس قدر طاقتور ہیں کہ جدید نیشنل ازم (قومیت پرستی) سے ان کی قومیت اور قومی تہذیب کو کسی قسم کا خطرہ نہیں تو ہم اپنی رائے واپس لینے کو تیار ہیں۔ لیکن اگر یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا اور ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ نہیں کیا جا سکتا............ محض جذبات سے اپیل کر کے آپ حقائق کو نہیں بدل سکتے۔ جہاں مریض کی آدھی جان نکل چکی ہو‘ اس کے سامنے سپہ سالار بن کر آنے سے پہلے آپ کو حکیم بن کر آنا چاہیے۔ پہلے اس کی نبض دیکھیے اور اس کے مرض کا علاج کیجیے‘ پھر اس کی کمر سے تلوار باندھ لیجیے گا۔ یہ کہاں کی ہوش مندی ہے کہ مریض تو بستر پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا ہے اور آپ اس کے سرہانے کھڑے خطبہ دے رہے ہیں کہ اُٹھ بہادر اپنی طاقت کے بل پر کھڑا ہو‘ باندھ کمر سے تلوار اور چل میدان کارزار میں۔‘‘

(۱۹۳۷ء‘ تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان‘ حصہ اول‘ صفحہ ۸۰ و ۸۱)

(۶) ’’ڈیڑھ سو برس تک مسلسل اور پیہم انحطاط کی طرف لے جانے کے بعد یہ انقلاب ہم کو ایک ایسے مقام پر چھوڑ رہا ہے جہاں ہماری جمعیت پراگندہ‘ ہمارے اخلاق تباہ‘ ہماری سوشل لائف ہر قسم کی بیماریوں سے زار و نزار اور ہمارے دین و اعتقاد تک کی بنیادیں متزلزل ہو چکی ہیں اور ہم موت کے کنارے پر کھڑے ہوئے ہیں۔‘‘

(۷) ’’یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس سے بھری ہوئی ہے۔ کیریکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافر قوموں میں پائے جاتے ہیں اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دینے والے جس قدر کافر قومیں فراہم کرتی ہیں غالباً اسی تناسب سے یہ بھی فراہم کرتی ہے۔ رشوت‘ چوری‘ زنا‘ جھوٹ اور دوسرے تمام ذمائم اخلاق میں یہ کفار سے کچھ کم نہیں ہے۔ پیٹ بھرنے اور دولت کمانے کے لیے جو تدبیریں کفار کرتے ہیں وہی اس قوم کے لوگ بھی کرتے ہیں۔ ایک مسلمان وکیل جان بوجھ کر حق کے خلاف اپنے مؤکل کی پیروی کرتے وقت خدا کے خوف سے اتنا ہی خالی ہوتا ہے جتنا ایک غیر مسلم وکیل ہوتا ہے۔ ایک مسلمان رئیس دولت پا کر یا ایک مسلمان عہدے دار حکومت پا کر وہی سب کچھ کرتا ہے جو غیر مسلم کرتا ہے۔ یہ اخلاقی حالت جس قوم کی ہو اس کی تمام کالی اور سفید بھیڑوں کو جمع کر کے ایک منظم گلہ بنا دینا اور سیاسی تربیت سے ان کو لومڑی کی ہوشیاری

سکھانا یا فوجی تربیت سے ان میں بھیڑیے کی درندگی پیدا کر دینا جنگل کی فرماں روائی حاصل کرنے کے لیے تو مفید ہو سکتا ہے‘ مگر میں نہیں سمجھتا کہ اس سے اعلائے کلمۃ اللہ کس طرح ہو سکتا ہے۔‘‘

(ستمبر ۱۹۴۰ء‘ تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان‘ حصّہ دوم‘ صفحہ ۱۷۳)

(۸)’’پس بجائے اس کے کہ ہم سادگی اور سادہ لوحی سے خود کام لیں یا دوسروں کو سادہ لوح فرض کر کے ان کی توجہ حقیقی مسائل سے ہٹانے اور فرضی مسائل کی طرف پھیرنے کی کوشش کریں‘ ہمیں واضح طور پر دیکھنا چاہیے کہ فی الواقع پاکستان کا بقاو تحفظ اور اس کا استحکام کن مسائل سے وابستہ ہے اور ہم کس طرح انہیں حاصل کر سکتے ہیں۔

اولین مسئلہ ملک کے اخلاق کا ہے جو تشویش ناک حد تک گر چکے ہیں۔ ہماری تمام مشکلات میں سب سے زیادہ اخلاق ہی کی خرابیاں کارفرما ہیں۔ اس بگاڑ کا زہر اتنے وسیع پیمانے پر ہماری سوسائٹی میں پھیل گیا ہے اور اتنا گہرا اتر چکا ہے کہ اگر ہم اسے اپنا قومی دشمن نمبر ایک قرار دیں تو ہرگز مبالغہ نہ ہو گا۔ کوئی بیرونی خطرہ ہمارے لیے اتنا خوف ناک نہیں ہے جتنا یہ اندرونی خطرہ ہے۔ یہ ہماری قوتِ حیات کو کھا گیا ہے اور کھائے چلا جا رہا ہے۔

پچھلے سال کے فسادات میں بداخلاقی کا جو طوفان اٹھا تھا وہ ہماری آبادی کے ایک بہت بڑے حصّہ کو بہا کر لے گیا ہے۔ قتل و خون‘ آتش زنی اور عورتوں کے بھگانے کی مشق تو شاید ہزاروں ہی کو ہوئی ہو گی لیکن لوٹ مار کی آلائش نے لاکھوں کو ملوث کر کے چھوڑا۔ اس اخلاقی زوال کی وسعت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک گاؤں کی ڈیڑھ ہزار کی آبادی میں سے صرف ایک شخص ایسا نکلا جس نے لوٹ میں حصّہ لینے سے پرہیز کیا تھا اور ایک قصبہ کے سات سو گھروں میں سے بمشکل پچیس گھر ایسے پائے گئے جن میں لوٹ کا مال نہ پہنچا تھا۔ پھر ان لٹیروں میں محض جاہل عوام اور بازاری لوگ ہی شامل نہ تھے‘ بڑے بڑے شرفاء اور معززین‘ اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ‘ سوسائٹی اور حکومت میں بڑے مرتبے رکھنے والے حضرات بھی اسی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہے تھے‘ بلکہ وہ تو اس میں خوب جی بھر کر نہائے۔ پولیس کے چھوٹے بڑے افسر‘ امن و امان کے ذمہ دار مجسٹریٹ‘ حکومت کے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ دار‘ بڑے بڑے نامور قومی کارکن‘ اسمبلی کے ممبر اور بعض وزراء تک اس گندگی میں غوطہ لگا گئے۔ یہ واقعات کسی سے چھپے ہوئے نہیں‘ ایک دنیا ان کو جانتی ہے اور شتر مرغ کی طرح ریت میں منہ چھپانے سے کچھ حاصل نہیں۔ یہ حقیقت اب کھل چکی ہے کہ ہمارے اخلاق کے جوڑ بند بری طرح ڈھیلے ہو گئے ہیں۔ ہم میں ہزارہا آدمی ایسے موجود ہیں جو قتل و خون کے مشاق

ہو چکے ہیں‘ ہزاروں ایسے لوگ ہیں جو موقع ملنے پر بد سے بدتر جرائم کا ارتکاب کر سکتے ہیں اور نیچے سے لے کر اونچے طبقوں تک کم از کم ۹۵ فی صد تعداد ان لوگوں کی ہے جنہیں حرام کا مال سمیٹنے میں قطعاً کوئی تامل نہیں ہے بشرطیکہ انہیں قانون کی گرفت سے محفوظ رہنے کا اطمینان ہو۔

ان حالات میں ہمارے لیے یہ کوئی وجہِ تسلی نہیں ہے کہ اس سے بدرجہا زیادہ بدتر اخلاقی صفات کا ظہور ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں سے ہوا ہے۔ جو زہر انہوں نے کھایا اس کی فکر انہیں ہو یا نہ ہو‘ ہمیں تو اس زہر کی فکر ہے جو ہماری رگوں میں اتر گیا ہے۔ کیا مشاق مجرموں اور بے باک خائنوں کی اتنی کثیر تعداد اپنے اندر لیے ہوئے ہم اپنی قومی زندگی کو مستحکم بنا سکتے ہیں؟ کیا وہ بداخلاقیاں جو کل غیروں کی جان و مال اور عصمت کے معاملے میں برتی گئی تھیں‘ ان کے ساتھ ہی ختم ہو گئیں اور اپنا کوئی پائدار اثر ہماری سیرت و کردار پر نہیں چھوڑ گئیں؟ کیا یہ بگڑے ہوئے اخلاق اب خود اپنوں پر ہاتھ صاف کرنے سے رکے رہ جائیں گے؟

ایک سال کا تجربہ ہمیں بتا رہا ہے کہ جس اخلاقی زوال کی خبر گزشتہ فسادات نے دی تھی وہ وقتی اور محدود نہیں تھا۔ دراصل وہ ایک نہایت خوف ناک مرض کی حیثیت سے ہمارے اندر اب بھی موجود ہے اور ہماری قومی زندگی کے ہر شعبے کو خراب کر رہا ہے .... لیکن یہ سب کچھ بڑی آسانی سے انگیز کیا جا سکتا تھا اگر ہمارے عوام و خواص اور ہمارے سربراہ کاروں کے اخلاق اتنے بگڑے ہوئے نہ ہوتے .... لیکن غور سے دیکھیے کہ اس طرح جو مشکلات حقیقتاً رونما ہوئی تھیں ان پر کتنا اضافہ ہماری اخلاقی خرابیوں نے کر دیا۔ ہندوؤں اور سکھوں نے جو عمارات‘ سامان‘ اموال‘ دکانیں‘ کارخانے‘ زمینیں اور دوسری چیزیں پاکستان میں چھوڑی تھیں اگر ان پر خود پاکستان کے باشندے‘ حکومت کے عمال اور قومی کارکن قبضے کر کے نہ بیٹھ جاتے تو کیا مہاجرین کو بسانے میں ہم کو وہی دِقتیں پیش آ سکتی تھیں جن سے اب ہم دوچار ہیں۔ مغربی پنجاب‘ سرحد اور سندھ کی حکومتوں سے پوچھیے کہ جانے والوں نے کیا کچھ چھوڑا تھا اور اس کا کتنا حصّہ آنے والوں کو دیا گیا اور کتنا حصّہ کن کن غیر مستحقین کو پہنچا۔ اگر یہ اعداد و شمار روشنی میں آ جائیں تو دنیا یہ دیکھ کر دنگ رہ جائے کہ مہاجرین کے مسئلے کا جو زخم غیروں نے ہم کو لگایا تھا اسے سرطان کا پھوڑا بنا دینے والے دراصل کون لوگ ہیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اس حمام میں آپ کس کس کو برہنہ دیکھیں گے۔

پھر جو لوگ کل تک ’’پاکستان زندہ باد‘‘ کے نعرے لگا رہے تھے‘ جن سے بڑھ کر قوم کے درد

میں تڑپنے والا کوئی نظر نہ آتا تھا‘ اور جو آج بھی زبان سے بہت بڑے ’’مجاہدِ ملت‘‘ بنے ہوئے ہیں‘ ان میں عظیم اکثریت آپ کو ایسے افراد کی نظر آئے گی جو پاکستان بننے کے بعد ہر زاویے سے اس کی کشتی میں سوراخ کیے جا رہے ہیں۔ یہ رشوت خوریاں‘ یہ خیانتیں‘ یہ غبن‘ یہ قومی خرچ پر اقرباء پروریاں اور دوست نوازیاں‘ یہ فرائض سے غفلت‘ یہ ڈسپلن سے گریز‘ یہ غریب قوم کی دولت پر عیاشیاں‘ جن کا ایک طوفان سا ہمارے نظامِ حکومت کے ہر شعبے میں برپا ہے اور جس میں بکثرت چھوٹے اہل کاروں سے لے کر بہت سے عالی مقام حکام اور وزراء تک آلودہ ہیں‘ کیا یہ سب پاکستان کو مضبوط کرنے والی چیزیں ہیں؟ یہ دوکانوں اور کارخانوں کی ناجائز تقسیم جس کی بدولت ملک کی صنعت وتجارت کا ایک بڑا حصّہ نا اہل اور ناتجربہ کار ہاتھوں میں چلا گیا ہے‘ کیا یہ پاکستان کی طاقت کو مستحکم کرنے والی چیز ہے؟ یہ پبلک کا بالعموم حکومت کے ٹیکس ادا کرنے سے گریز کرنا اور ان سے بچنے کے لیے نیز دوسرے ناجائز فوائد حاصل کرنے کے لیے سرکاری ملازموں کو رشوت دینا‘ اور جہاں بھی قانون کی گرفت سے بچ نکلنے کی امید ہو پبلک فنڈ کا بڑے سے بڑا نقصان کرنے میں بھی تامل نہ کرنا‘ کیا یہی وہ چیزیں ہیں جن سے پاکستان مضبوط ہوسکتا ہے؟ ملک کے باشندوں کی اخلاقی حالت اس قدر گر چکی ہے کہ ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کی لاشیں جب واہگہ اور لاہور کے درمیان پڑی سڑ رہی تھیں اور کیمپوں میں بھی موت کا بازار گرم تھا اس وقت بارہ تیرہ لاکھ کے شہر میں سے چند ہزار نہیں چند سو آدمی بھی ایسے نہ نکلے جو اپنے بھائیوں کو دفن کرنے کی زحمت اٹھاتے۔ متعدد مثالیں ہمارے علم میں ایسی ہیں کہ کوئی مہاجر مر گیا اور اس کے عزیزوں کو نمازِ جنازہ پڑھنے کے لیے اجرت پر آدمی فراہم کرنے پڑے۔ یہاں تک بھی نوبت پہنچی ہے کہ سرحد کے قریب کسی گاؤں میں مہاجرین کو زمینیں دی گئیں اور مقامی مسلمانوں نے سرحد پار سے سکھوں کو بلا کر ان پر حملہ کرا دیا تاکہ یہ بھاگ جائیں اور زمین ہمارے قبضہ میں رہ جائے۔ حد یہ کہ قوم کی جو بیٹیاں ہندوستان سے بچ کر آ گئی تھیں ان کی عصمتیں یہاں خود اپنے بھائیوں کے ہاتھوں محفوظ نہ رہ سکیں .... اس قسم کے واقعات شاذ نہیں ہیں بلکہ بکثرت ہمارے علم میں آئے ہیں اور ان شرم ناک جرائم کے مرتکب صرف عام شہدے ہی نہیں تھے .... کیا اتنے شدید اخلاقی تنزل کے ہوتے ہوئے ہم یہ امید کر سکتے ہیں کہ کسی بڑی اندرونی یا بیرونی مصیبت کے مقابلے میں ہم مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہو سکیں گے؟ اور کیا یہ اخلاقی تنزل اپنے ملک کی تعمیر کے لیے ہماری کسی اسکیم کو کامیابی کے ساتھ چلنے دے گا؟‘‘ (اگست ۱۹۴۸ء‘ تحریک آزادئ ہند اور مسلمان‘ حصّہ دوم‘ صفحہ ۳۱۷ تا ۳۲۲)

(۹) ’’ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری آبادی کا بڑا حصّہ‘ بہت بڑا حصّہ احکامِ الٰہی سے بُعد رکھتا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے ملک میں اعلانیہ خدا کے احکام کی خلاف ورزی ہو رہی ہے اور ایسے نازک وقت میں بھی لوگ اُس سے باز نہیں آتے جب کہ ہم اپنے آپ کو چاروں طرف سے خطرات میں گھرا ہوا پاتے ہیں اور خدا سے نصرت مانگ رہے ہوتے ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے ملک میں فرنگیت اور فسق و فجور کی رو بڑھتی چلی جا رہی ہے اور آج وہ کچھ ہو رہا ہے جو انگریز کے زمانے میں بھی نہ ہوتا تھا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اسلام آج بھی اسی طرح بے بس ہے (اسلام کبھی بے بس نہیں ہوتا: مرتّب) جس طرح انگریز کے زمانے میں تھا۔ بلکہ اس کے اصول‘ قوانین اور احکام اس وقت کچھ زیادہ پامال کیے جا رہے ہیں‘ جرأت اور جسارت کے ساتھ کیے جا رہے ہیں‘ کھلم کھلا کیے جا رہے ہیں‘ بڑے پیمانے پر کیے جا رہے ہیں۔ ان کے خلاف چلنے کی اعلانیہ تبلیغ ہو رہی ہے اور عوام الناس کو ان کے خلاف چلانے کی منظم کوششیں کی جا رہی ہیں۔

ملک کے تمام طبقے کیریکٹر کے بودے پن اور بے ضمیری میں مبتلا ہیں۔ اخلاقی خرابیاں ایک وبا کی طرح پھیل رہی ہیں۔ تمام اخلاقی حدود توڑ کر رکھ دی گئی ہیں اور عام طور پر لوگوں کے دلوں سے یہ احساس مٹتا جا رہا ہے کہ اخلاق بھی کوئی چیز ہے جس کے تقاضوں کا کچھ لحاظ آدمی کو کرنا چاہیے۔ عوام ہوں یا تعلیم یافتہ حضرات‘ سرکاری افسر اور اہل کار ہوں یا سیاسی لیڈر اور پارٹیوں کے کارکن‘ اخبار نویس ہوں یا اہلِ قلم‘ تاجر ہوں یا اہلِ حرفہ‘ زمین دار ہوں یا کسان‘ جس طبقے کو دیکھیے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اخلاقی ذمہ داریوں کو بھول چکا ہے اور کسی ایسی حد سے واقف نہیں رہا جس پر وہ اپنی اغراض و خواہشات کے پیچھے دوڑتے ہوئے رک جائے۔ ہر شخص اپنا مطلب حاصل کرنے کے لیے ہر بدتر سے بدتر ذریعہ اختیار کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ حرام اور حلال کی تمیز اُٹھ چکی ہے۔ گناہ اور صواب کا احساس مٹ گیا ہے۔ برائی اور بھلائی کے فرق سے نگاہیں بند کر لی گئی ہیں۔ لوگوں کے ضمیر نے ان کے ذاتی مفاد کے آگے سپر ڈال دی ہے۔ فرائض کو لوگ بھول چکے ہیں اور حقوق سب کو یاد ہیں۔ جھوٹ‘ فریب اور چال بازی کام نکالنے کے مقبول ترین ہتھیار بن گئے ہیں۔ رشوت‘ خیانت اور حرام خوری کے دوسرے ذرائع شیر مادر کی طرح حلال ہو گئے ہیں۔ مال والوں کے مال ضمیروں‘ عصمتوں اور شرافتوں کے خریدنے میں صرف ہو رہے ہیں اور بیچنے والے دھڑلے سے اخلاق کے وہ سارے جوہر بیچ رہے ہیں جو ان کی نظر میں روپے سے کم قیمت رکھتے ہیں۔ انگریز کے زمانے میں سرکاری محکموں کے ڈسپلن‘ کارکردگی اور سرکاری ملازمین کی فرض شناسی کا جو حال تھا‘ آج اس کا ۲۵

فی صدی بھی نہیں ہے۔ البتہ رشوت‘ دوست نوازی‘ اقربا پروری‘ خیانت‘ غبن اور سعی وسفارش کی کارفرمائی میں سو فی صدی اضافہ ہو گیا ہے۔ .... بڑے افسروں سے چھوٹے کارکن تک بالعموم اس قدر خودغرض‘ نافرض شناس اور بے باک ہو چکے ہیں کہ اپنے ذرا سے فائدے کے لیے قوم اور ریاست کا بڑے سے بڑا نقصان کر دینے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ حق اور انصاف ان کے لیے بے معنی الفاظ بن گئے ہیں۔ ڈیوٹی کی انہیں کوئی پرواہ نہیں رہی ہے۔‘‘ (روداد جماعت اسلامی‘ ششم‘ صفحہ ۶۱‘ ۶۲‘ ۶۵‘ ۶۶‘ ۶۹)

ضمیمہ ۲: انتخابات کی حقیقت

’’سب سے زیادہ خطرناک حرکت جو یہ لوگ کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ انہوں نے انتخابات کو اس ملک میں بالکل دھن‘ دھونس‘ دھوکے اور دھاندلی کا کھیل بنا کر رکھ دیا ہے اور اس کھیل میں یہ حکومت کے اختیارات اور ذرائع کو کھلم کھلا استعمال کر رہے ہیں۔ یہ صرف ایک بددیانتی ہی نہیں ہے بلکہ صریحاً ملک کی تخریب ہے۔ یہ ایک سخت حماقت ہے جس کے خوفناک نتائج کا شاید انہیں اندازہ نہیں ہے۔ یہ اس ملک کے ساتھ سب سے بڑی غداری‘ بدخواہی اور دشمنی ہے کہ یہاں کے لوگوں کو جمہوری و آئینی ذرائع سے مایوس کر دیا جائے اور انہیں یقین دلایا جائے کہ اب یہاں جو سیاسی تغیر بھی ہوگا‘ غیر آئینی اور غیر جمہوری طریقوں ہی سے ہو سکے گا...... جمہوری انتخابات ہمیں اس پُرخطر راستے پر جانے سے بچا لیتے ہیں‘ لیکن ان کا حقیقی فائدہ ہم کو صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جبکہ ہمارے ہاں انتخابات بالکل ایمان داری کے ساتھ آزادانہ فضا میں ہوں.......

اب دیکھیے آپ کے ملک میں انتخابات کس ڈھب پر ہو رہے ہیں۔

یہاں انتخاب کا پہلا مرحلہ اس طرح طے ہوتا ہے کہ مخالف پارٹیوں کو پریس کی طاقت سے بالکل یا بڑی حد تک محروم کر دیا جاتا ہے۔ (واضح رہے کہ یہ تحریر ۱۹۵۱ء کی ہے) .... مولویوں اور پیروں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں اور روپے دے دے کر ان سے خطرے کی گھنٹیاں بجائی جاتی ہیں۔ اصل مسائل زندگی سے لوگوں کی توجہ ہٹا کر طرح طرح کے مذہبی اور غیر مذہبی جھگڑے کھڑے کیے جاتے ہیں۔ پوری کوشش کی جاتی ہے کہ عوام الناس کو جتنا دھوکا دیا جا سکتا ہے دیا جائے اور انہیں بے لاگ طریقے سے صاف فضا میں کچھ سوچنے اور سمجھنے کے قابل نہ چھوڑا جائے۔

اس کے بعد انتخابات کے دوسرے مرحلے کی مہم اس طرح سر کی جاتی ہے کہ رائے دہندوں کی

فہرستوں میں ہزار ہا جعلی ووٹروں کے نام درج کرائے جاتے ہیں اور ہزار ہا اصلی ووٹروں کے نام ساقط کروا دیے جاتے ہیں۔ یہ خدمت سرکاری عملے سے لی جاتی ہے۔

پھر اصل انتخابات کا موقع آتا ہے اور اس وقت کوئی قسم بے ایمانی کی ایسی نہیں ہوتی جو نہ کی جاتی ہو۔ ہزار ہا کرائے کے آدمی لاریوں اور ٹرکوں میں بھر بھر کر لائے جاتے ہیں۔ وہ علی الاعلان پولیس اور پریزائیڈنگ افسروں کے سامنے جعلی ووٹ ڈالتے ہیں اور اعتراض کرنے والوں کی کوئی نہیں سنتا۔ ایک ایک شخص پندرہ پندرہ اور بیس بیس مرتبہ مختلف ناموں سے آتا ہے اور ووٹ ڈالتا ہے اور فی ووٹ ایک مقررہ رقم حاصل کر لیتا ہے۔ پنجاب میں ایک مثال ایسی بھی دیکھی گئی کہ ایک شخص نے ۵۱ مرتبہ ووٹ ڈالا۔ حد یہ ہے کہ قوم کی بیٹیوں تک کو سکھایا جاتا ہے کہ وہ کبھی کسی کی بیوی بن کر ووٹ ڈالیں اور کبھی کسی کی بیٹی بن کر۔ یہ کام اسکولوں اور کالج کی لڑکیوں تک سے لینے میں شرم نہیں کی جاتی اور نہیں سوچا جاتا کہ ہم اپنی قوم کی لڑکیوں کو یہ کیسے اخلاق سکھا رہے ہیں۔‘‘

(روداد جماعت اسلامی‘ حصہ ششم‘ صفحہ ۸۲ تا ۸۶)

۱۹۵۱ء ہی کے اجتماعِ عام میں جناب نعیم صدیقی صاحب اپنے مقالہ ’’اسلامی تحریک دوسری اجتماعی تحریکوں کے مقابل‘‘ میں فرماتے ہیں:

’’جمہوری نظام میں تبدیلیاں لانے میں اولین اور سب سے بڑی بھاری رکاوٹ دستور کی رکاوٹ ہوتی ہے۔ پھر دوسری بڑی مشکل یہ ہے کہ رائے عامہ کے بنانے میں جن ذرائع و وسائل سے کام لیا جاتا ہے وہ سارے کے سارے سرمایہ دار طبقے کے ہاتھ میں ہیں۔ خصوصیت سے پریس کی طاقت‘ جو رائے عامہ پر کمانڈ کرتی ہے‘ ایک ہی طبقے کے چند گنے چنے افراد کے قابو میں ہے اور وہ اس طاقت کے ذریعے رائے عامہ کے بہاؤ کو اپنے طبقے کے مفاد کے خلاف کبھی جانے نہیں دیتے۔ قوم کی قوم کو چند افراد حالت کا ایک خاص رنگین عینک سے مطالعہ کراتے ہیں‘ ان کو ایک زاویۂ نظر دیتے ہیں‘ ان کا سامنے ایک خاص طرزِ فکر کو ابھار ابھار کر لاتے ہیں اور ان کے بعض رجحانات کو خاص طور پر غیر اہم بنا بنا کر پیچھے دھکیلتے رہتے ہیں۔ چنانچہ یہ پریس انتخابات کے زمانے میں ذہنی فضا کو اتنا مکدر کر دیتا ہے کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کام نہیں کر سکتیں اور رائے عامہ کا بہاؤ خالص جذباتی ہو جاتا ہے۔ اس طرح جب ووٹروں کے فکر کے جہاز بے لنگر ہو جاتے ہیں تو پروپیگنڈے کی ہوا ان کو جدھر چاہتی ہے دھکیل کر لے جاتی ہے۔

پھر جمہوریت کا جوہر آزادیٔ انتخاب اور آزادیٔ رائے کا متقاضی ہے لیکن دنیا کا کوئی

جمہوری نظام ایسا نہیں کہ جہاں ووٹروں کی آزادیٔ انتخاب صحیح معنوں میں کام کر سکے۔ آزادیٔ انتخاب کی جڑ تو امیدواری کا اُصول اول قدم پر کاٹ دیتا ہے۔

پھر بات اتنی ہی نہیں بلکہ ووٹوں کے باقاعدہ سودے ہوتے ہیں اور انتخاب کی منڈی کے بعض ''ہول سیل ڈیلر'' تو بہت بڑے پیمانے پر کاروبار کرتے ہیں۔ جی ہاں پاکستان ہی میں نہیں، برطانیہ اور امریکہ جیسے ممالک میں بھی یہ کاروبار ہوتا ہے۔ مروّت کی قیمت پر بھی ہوتا ہے اور عورتوں کے حسن و جمال کی قیمت پر بھی۔ اپنی پارٹی کے حامیوں اور ووٹروں کو امیدوار سب سے بڑا لالچ جو دیتے ہیں وہ حکومت کے انتظامی عہدوں اور سرکاری محکموں سے مختلف کام نکالنے کی آسانیوں کا لالچ ہوتا ہے۔ علاوہ بریں انتخابی پارٹیاں اور عام امیدوار کامیاب ہونے کے لیے عوام کے ووٹ اس قیمت پر حاصل کرتے ہیں کہ وہ برسرِ اقتدار آ کر ان کی کچھ خواہشات پوری کریں گے، قطع نظر اس سے کہ ان خواہشات کا پورا کرنا ملک کے مجموعی مفاد کے لیے کتنا ہی مہلک کیوں نہ ہو۔ یہ انتخابی کاروبار ووٹروں کی آزادیٔ رائے کا درحقیقت خاتمہ کر دیتا ہے۔

علاوہ بریں، برطانوی نظام انتخاب کے بارے میں خود برطانوی لیبر پارٹی کا مشہور رہنما رمزے میور اپنی رائے دیتے ہوئے اس کو ''انتہائی غیر منصفانہ، غیر اطمینان بخش اور خطرناک'' قرار دیتا ہے۔ اس کا تجزیہ یہ ہے کہ اگر ووٹوں کے استعمال کی حقیقت کو دیکھا جائے تو کتنے ووٹ اس لیے نہیں ڈالے جاتے کہ بہت سے ووٹروں کی پسند کے مطابق صحیح معیاری امیدوار موجود نہیں ہوتا۔ اور کتنے ووٹ ایک معیاری امیدوار کے سامنے نہ ہونے کی وجہ سے ''بڑی بلا کے مقابلے میں چھوٹی بلا'' کے اصول پر نااہل لوگوں کو دے دیے جاتے ہیں۔ اور کتنے ووٹ ناکام امیدواروں کو دیے جانے کی وجہ سے بلحاظ نتیجہ ضائع ہو جاتے ہیں۔ (اس طرح) ستر فی صدی رائے دہندگان حالات پر اثر انداز ہونے سے محروم رہ جاتے ہیں اور ملک کا نظام صرف تیس فی صدی ووٹروں کی مرضی پر چلتا ہے............ مشکل اتنی ہی نہیں، مشکل یہ بھی ہے کہ پارٹی سسٹم پر جمہوری نظام کے چلنے کی وجہ سے لوگوں کی وہ اکثریت جو نہ تو اپنے تقاضوں کے مطابق کوئی پارٹی میدان میں پاتی ہے اور نہ پارٹی بنانے کے لیے نمایاں شخصیتیں اور صلاحیتیں اور ذرائع و وسائل رکھتی ہے، اسے مجبوراً بااثر اور نمایاں پارٹیوں کے ساتھ مصالحت کر کے اپنے آپ کو ان کے حوالے کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح عوام کے بہت سے حقیقی رجحانات جمہوری نظاموں میں اپنے لیے کوئی راستہ ہی نہیں پا سکتے۔''

دستور میں ترمیم کے طریقہ کار کی پیچیدگیوں کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

’’اس توضیح سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ جمہوری نظاموں میں کسی بڑی اصولی تبدیلی کے لیے کوئی راستہ کھلا ہوا نہیں ہے۔‘‘ (روداد جماعت اسلامی‘ حصہ ششم‘ صفحہ ۲۲۶ تا ۲۳۲)

’’لہٰذا اگر ہم فی الواقع اپنے ملک کے نظامِ زندگی کو فسق و ضلالت کی راہ سے ہٹا کر دینِ حق کے صراطِ مستقیم پر چلانا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے ناگزیر ہے کہ بگاڑ کو مسندِ اقتدار سے ہٹانے اور بناؤ کو اس کی جگہ متمکن کرنے کی براہِ راست کوشش کریں............ یہ تبدیلی کس طرح ہوسکتی ہے؟ ایک جمہوری نظام میں اس کا راستہ صرف ایک ہے‘ اور وہ ہے انتخابی جِدّ و جُہد............ ہماری تشخیص یہ ہے کہ اس ملک کے سیاسی نظام کی خرابیوں کا بنیادی سبب یہاں کے طریق انتخاب کی خرابی ہے۔ جب انتخاب کا موسم آتا ہے تو منصب و جاہ کے خواہش مند لوگ اٹھ کر کھڑے ہوتے ہیں اور دوڑ دھوپ کر کے یا تو کسی پارٹی کا ٹکٹ حاصل کرتے ہیں یا آزاد امیدوار کی حیثیت سے اپنے لیے کوشش شروع کر دیتے ہیں۔ اس کوشش میں وہ کسی اخلاق اور کسی ضابطے کے پابند نہیں ہوتے۔ کسی جھوٹ‘ کسی فریب‘ کسی چال‘ کسی دباؤ اور کسی ناجائز ہتھکنڈے کے استعمال میں بھی ان کو دریغ نہیں ہوتا۔ جسے لالچ دیا جاسکتا ہے اس کا ووٹ لالچ سے خریدتے ہیں۔ جسے دھمکی سے مرعوب کیا جاسکتا ہے اسے مرعوب کر کے ووٹ حاصل کرتے ہیں۔ جسے دھوکا دیا جاسکتا ہے اس کا ووٹ دھوکے سے لیتے ہیں اور جس کو کسی تعصب سے اپیل کرنا ممکن ہوتا ہے اس کا ووٹ تعصب کے نام پر مانگتے ہیں۔ اس گندے کھیل کے میدان میں قوم کے شریف عناصر اوّل تو اُترتے ہی نہیں‘ اور بھولے بھٹکے کبھی اُتر بھی آتے ہیں تو پہلے ہی قدم پر انہیں میدان چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ مقابلہ صرف ان لوگوں کے درمیان رہ جاتا ہے جنہیں نہ خدا کا خوف ہو‘ نہ خلق کی شرم اور نہ کوئی بازی کھیل جانے میں کسی طرح کا باک۔ پھر ان میں سے کامیاب ہو کر وہ نکلتا ہے جو سب چال بازوں کو چال بازی میں شکست دے دے۔ رائے دینے والی پبلک جس کے ووٹوں سے یہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں نہ اُصولوں کو جانچتی ہے‘ نہ پروگراموں کو پرکھتی ہے‘ نہ سیرتوں اور صلاحیتوں کو دیکھتی ہے۔ اس سے جو بھی زیادہ ووٹ جھپٹ لے جائے وہ جیت جاتا ہے۔ بلکہ اب تو اس کے حقیقی ووٹوں کی اکثریت بھی کوئی چیز نہیں رہی ہے۔ کرائے پر ووٹ دینے والے جعلی ووٹر اور بددیانت پولنگ افسر اپنے ہاتھوں کے کرتب سے بارہا ان لوگوں کو شکست دے دیتے ہیں جن کو اصلی رائے دہندگان کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہوتا ہے............ ہر شخص جو کچھ بھی عقل رکھتا ہے‘ ان حالات کو دیکھ کر خود یہ اندازہ کرسکتا ہے کہ جب تک یہ طریقِ انتخاب جاری ہے‘ کبھی قوم کے شریف‘ نیک اور ایمان دار آدمیوں کے ابھرنے کا امکان ہی

نہیں ہے۔ اس طریقے کا تو مزاج ہی ایسا ہے کہ قوم کے بدتر سے بدتر عناصر چھٹ کر سطح پر آئیں اور جس بداخلاقی و بدکرداری سے وہ انتخاب جیتتے ہیں اُسی کی بنیاد پر وہ ملک کے انتظام کو چلائیں۔‘‘ (روداد جماعت اسلامی، حصہ ششم، صفحہ ۴۰۹ تا ۴۱۱)

انتخابات ہی سے متعلق ایک اقتباس جو کہ اصلاً تو تقابلی جائزے کا حصہ ہے لیکن فی الوقت یہاں درج کیا جا رہا ہے:

’’رسولِ برحق ﷺ کے یہ ارشادات بجائے خود حکمت و دانائی کے جواہر تھے جن کی سچائی پر عقلِ عام گواہی دے رہی تھی، لیکن اب تو زمانے کے تجربات نے بھی ان پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ اب ہم کو اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہا ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی اور قومی سیاست کو جن چیزوں نے سب سے بڑھ کر گندا کیا ہے ان میں سے ایک یہ امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا طریقہ ہے۔ اسی بنا پر جماعت اسلامی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس ناپاک طریق انتخاب کی جڑ کاٹ دی جائے۔ جماعت نہ اپنے پارٹی ٹکٹ پر آدمی کھڑے کرے گی نہ اپنے ارکان کو آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونے کی اجازت دے گی۔ نہ کسی ایسے شخص کی تائید کرے گی جو خود امیدوار ہو اور اپنے لیے آپ ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرے، خواہ انفرادی طور پر یا کسی پارٹی ٹکٹ پر۔ یہی نہیں بلکہ جماعت اپنی انتخابی جِدّ و جُہد میں خاص طور پر یہ بات عوام الناس کے ذہن نشین کرائے گی کہ امیدوار بن کر اٹھنا اور اپنے حق میں ووٹ مانگنا آدمی کے غیر صالح اور نااہل ہونے کی پہلی اور کھلی ہوئی علامت ہے۔ ایسا آدمی جب کبھی اور جہاں کہیں سامنے آئے، لوگوں کو فوراً سمجھ لینا چاہیے کہ یہ ایک خطرناک شخص ہے۔ اس کو ووٹ دینا اپنے حق میں کانٹے بونا ہے .... پنچایتی نظام کے ذریعے نمائندے کے انتخاب کے بعد کہا گیا: اس طریقے سے جو شخص چھانٹا جائے گا اسے حلقۂ انتخاب کے عوام کی طرف سے کھڑا کیا جائے گا..... کو یہ حق تو ضرور ہوگا کہ کسی دوسرے حلقے میں کسی دوسرے مردِ صالح کی تائید کے لیے جا کر انتخابی جِدّ و جُہد کرے، مگر خود اپنے حلقے میں اپنے لیے وہ کوئی جِدّ و جُہد کرنے کا حق دار نہ ہوگا۔ اپنے حلقے میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ اسے کرنا ہوگا وہ صرف یہ کہ اگر حلقے کے عام لوگ اس کو دیکھنا اور اس کے خیالات سننا چاہیں گے تو وہ ان کے جلسوں میں آئے گا اور ان کو موقع دے گا کہ وہ اسے اچھی طرح سمجھیں اور ہر پہلو سے پرکھ لیں۔‘‘ (جماعت اسلامی کی انتخابی جِدّ و جُہد)

موسس: ڈاکٹر اسرار احمدؒ
نگران: شجاع الدین شیخ

رجوع الی القرآن کورس

تعارفی نشست

قرآن اکیڈمی ڈیفنس

28 اپریل 2024ء

اتوار صبح 9 بجے

آغاز

درج ذیل اکیڈمیز میں

29 اپریل 2024ء

بروز پیر

صبح 08:45 تا دوپہر 01:00 بجے

پیر تا جمعہ

خواتین کیلئے شرکت کا باپردہ انتظام ہے

دورانیہ: 10 ماہ

مضامینِ تدریس

سالِ اوّل

- بیان القرآن
- قرآن حکیم کا منتخب نصاب
- سیرت النبی ﷺ
- توسیعی محاضرات
- ترجمہ قرآن حکیم مع ترکیب
- سیرت صحابہ رضی اللہ عنہم
- عربی گرامر
- ناظرہ قرآن حکیم و تجوید
- عقیدہ و فقہ
- فکر اسلامی
- حدیث و سنت

سالِ دوم

- علم العقیدہ
- اصول التفسیر
- اصول الحدیث
- اصول الفقہ
- فقہ المعاملات
- علوم القرآن
- تفسیر القرآن
- علم الحدیث
- فقہ العبادات
- اللغۃ العربیۃ وادبھا
- الفکر الاسلامی

ہاسٹل کی سہولت قرآن اکیڈمی یسین آباد میں صرف حضرات کے لیے دستیاب ہے

www.QuranAcademy.edu.pk

info@QuranAcademy.edu.pk

قرآن اکیڈمی ڈیفنس	قرآن اکیڈمی یٰسین آباد	قرآن اکیڈمی کورنگی	قرآن انسٹیٹیوٹ گلستان جوہر	قرآن انسٹیٹیوٹ لطیف آباد حیدر آباد	دارالاسلام مرکز تنظیم اسلامی لاہور
021-35340022-4 0334-3088689	021-36806561 0331-7292223	021-35078600 0343-1216738	021-34030119 0333-4030115	0334-3350910 0345-2701363	(042)35473375-78 0333-5632242

May 2024
Vol.73

Regd. CPL No.115
No.5

Monthly Meesaq Lahore